بابِل کا مینار

(افسانوی مجموعہ)

اختر آزاد

ناشر
بزم ہم قلم
H-3، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵

نام کتاب : بابِل کا مینار Babil Ka Minar
مصنّف : اختر آزاد Akhtar Azad
مرتّب : منظر کلیم
سنِ اشاعت : ۲۰۰۰ء 2000 A-D
تعداد : ۵۰۰ (پانچ سو)
قیمت : 140/- روپئے
مطبوعہ : لبرٹی آرٹ پریس، دریا گنج، دہلی ۔۱۱۰۰۰۲
ناشر : بزم ہم قلم، H-3، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی ۔۲۵
سرِ ورق : اروند کمار
کمپوزنگ : ذہین کمپیوٹر، ابوالفضل انکلیو، اوکھلا، نئی دہلی

مصنّف کے پتے:
(۱) مکان نمبر ۔۳۸، روڈ نمبر ۔۱، آزاد نگر، جمشید پور ۔۸۳۲۱۱۰ (بہار)
(۲) شعبہ اُردو، جواہر نوادیہ ودیالیہ، جوگنا، لوہردگا ۔۸۳۵۳۰۴ (بہار)

کتاب ملنے کے پتے:
۱۔ مکتبہ جامعہ، دہلی، بمبئی، علی گڑھ
۲۔ بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ
۳۔ انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر، راؤز ایونیو، نئی دہلی ۔۲
۴۔ ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، کوچہ پنڈت، دہلی ۔۶
۵۔ آزاد کتاب گھر، ساکچی، جمشید پور
۶۔ تنویر کتاب کونا، سی ایس کالونی، آزاد نگر، جمشید پور ۱۰

انتساب

والد محترم محمد حسین

اور والدہ محترمہ نجم النساء

کے نام

جن کی شفقتوں اور دعاؤں کے طفیل

میرے قلم کو جنبش عطا ہوئی

اور میں

اختر علی

سے

اختر آزاد

بنا

فہرست

ایک نئے پڑاؤ کی کہانی

قلم کا مزدور اگر اسی طرح مزدوری کرے گا، تو کاغذی نگر میں ایک نیا 'پڑاؤ' بنے گا۔ میں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۸۵ میں کیا۔ پندرہ سالہ ادبی سفر میں، میں نے افسانے کے بے شمار 'پڑاؤ' دیکھے۔ لیکن کہیں رُکا نہیں۔ رُکا بھی ہوں تو دو پل کے لئے۔ اس کے بعد آگے بڑھ گیا ہوں۔ رُکنا اور آگے بڑھنا ہی آج میرے افسانے کا مقدر ہے۔ کہیں بھی میرے ادبی ذہن کو سکون میسر نہیں ہو پایا۔ کسی بھی پڑاؤ سے دوسرے پڑاؤ کی طرف بڑھتا ہوں تو آج کا افسانہ میرے سامنے سراپا سوال بن جاتا ہے۔ ''تم کون ہو۔ تم مجھے کس روپ میں دیکھنا چاہتے ہو۔ اور کیوں دیکھنا چاہتے ہو۔'' جواب کے لئے میں اِدھر اُدھر نظریں گھماتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ بہت سارے افسانے میرا تعاقب کر رہے ہیں۔ جو دیکھتے ہی دیکھتے مجھے پکڑ کر واپس 'پڑاؤ' میں لے جاتے ہیں۔ 'پڑاؤ' میری حالت زار پر پہلے قہقہہ لگاتا ہے۔ پھر مسکراتے ہوئے میرے کاندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیتا ہے۔ ''اختر آزاد! تم افسانوی دنیا میں ابھی نو وارد ہو۔ اس لئے کہیں رُکتے نہیں۔ جس دن تھک جاؤ گے اس دن تم بھی کسی 'پڑاؤ' میں رُکنا چاہو گے، تب تمہیں نہ کوئی پہچانے گا اور نہ ہی کوئی تمہیں اپنے 'پڑاؤ' میں رُکنے کے لئے جگہ دے گا۔ اس لئے وقت کے نباض بنو اور میرے فسانوی بستر پر اپنے افسانوی جسم کو لٹا کر اپنی آنکھیں موندلو۔ میں تمہاری نیند میں گھل کر تمہاری روح میں اُتر جاؤں گا۔ پھر تمہیں میرا یہ 'پڑاؤ' اچھا لگے

گا۔ لوگ تمہیں پہچاننے لگیں گے۔ تب تم مجھے چھوڑ کر جانا چاہو گے تو تمہارے اندر کا افسانوی انسان تمہیں روک لے گا۔''

میں کہیں رُکتا کیوں نہیں؟ جب کہ مجھے اپنے مختصر ادبی سفر اور اپنی کم علمی کا بخوبی علم ہے۔ لیکن سوچتا ہوں کہ کاغذی سڑک پر افسانوی گاڑی دوڑاتے دوڑاتے اگر زندگی کے یہ سارے پڑاؤ ایک ایک کر کے پیچھے چھوٹ گئے تو پھر میرا کیا ہوگا......؟ یہی میرا اور میرے افسانے کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ اس لئے میں اپنے پندرہ افسانوں کے ہمراہ افسانوی سفر کے اپنے اس پہلے 'پڑاؤ' میں آپ کے پاس کچھ دیر کے لئے رُکنا چاہتا ہوں۔ خود سمجھنے اور اپنے آپ کو سمجھانے کے لئے۔ یہاں میں آپ کی نظر سے اس 'پڑاؤ' کو دیکھوں گا۔ اگر قابل قبول ہوگا تو کچھ دیر کے لئے ٹھہر جاؤں گا۔ ورنہ آگے بڑھ جاؤں گا۔ ایک نئے 'پڑاؤ' کی تلاش میں......!

افسانہ کیا ہے۔ میں افسانہ کیوں لکھتا ہوں؟ مجھے افسانے میں کسی چیز کی تلاش ہے۔ یہ مجھے خود بھی معلوم نہیں۔ ہاں! جب کبھی معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں، خود سے اُلجھ جاتا ہوں۔ اور جب بھی اُلجھتا ہوں۔ میری 'اُلجھن' افسانہ بن جاتی ہے۔ جب تک میں افسانہ لکھ رہا ہوتا ہوں، میرے اندر کوئی دوسرا 'نواس' کر رہا ہوتا ہے۔ اُس وقت میرا اپنا کچھ بھی میرے پاس نہیں ہوتا۔ دوسرے کا سب کچھ میرا ہو جاتا ہے۔ اور میں دوسرے کا ہو جاتا ہوں۔ دوسرے کی زندگی جینا کتنا اذّیت ناک ہوتا ہے، یہ تو وہی بتا سکتا ہے جس نے دوہری زندگی کا دوہرا کرب جھیلا ہے۔ لیکن اس تخلیقی کرب میں بھی تخلیق کار ہر پل ایک انجانی طرب سے ہم کنار ہوتا ہے۔ میں خوش قسمت ہوں اس معنیٰ میں کہ میں نے ایک ایسے دور میں لکھنا شروع کیا۔ جب جدید، علامتی اور بے پلاٹ افسانے، بیانیہ کے آئینے میں اپنا چہرہ سنوارنے میں ہمہ تن مصروف تھے۔ 'پڑاؤ' سے مڑ کر جب پیچھے اپنے گھر کی طرف نظر ڈالتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ میرے والد محمد حسین جو تین بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹے تھے، اُن کی عمر ابھی دو سال ہی تھی کہ اُن کے سر سے ماں باپ کا سایہ اُٹھ گیا۔ میرے دادا اکبر علی بھاگل پور کے شام پور علاقے میں چھوٹے موٹے زمیندار تھے۔ اُن کے انتقال کے بعد یہ

خاندان بکھر کر رہ گیا۔ ہوش سنبھالتے ہی والد صاحب جمشید پور آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ٹین پلیٹ کمپنی میں فورمین کے عہدے تک پہنچنے کے بعد حال ہی میں ریٹائرڈ ہوئے۔ ایک چھوٹے سے گاؤں میں پڑھائی لکھائی کی سہولتیں نہیں ہونے کی وجہ سے 'الف، ب' بھی نہیں پڑھ سکے۔ لیکن برسرِ روزگار ہونے کے بعد ایک یتیم اور بے سہارا، دیہاتی ان پڑھ بچّے نے ماہانہ ملنے والی تنخواہ کی رسید پر انگوٹھا لگانا اپنی توہین سمجھا۔ اور پہلی ہی PAY SLIP پر تھرتھراتے ہاتھوں سے آڑی ترچھی لکیریں کھینچ کر جس طرح دستخط کیا۔ اُس سے ان کی ہمّت اور کچھ کر گزرنے کے جذبے کا اندازہ آپ بخوبی لگا سکتے ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے کبھی پیچھے مُڑ کر نہیں دیکھا۔ دن میں کام کرنا اور رات میں پڑوس کے ایک کم عمر لڑکے سے پڑھنا لکھنا سیکھنا، جیسے اس کی زی کا مقصد ہو کر رہ گیا تھا۔ آج اردو ہندی اور عربی کے ساتھ ساتھ اپنی ضرورت کے حساب سے تھوڑی بہت انگریزی بھی جانتے ہیں۔ اُن کی محنت، انتھک لگن اور علم سے بے اِنتہا پیار کا ہی نتیجہ ہے کہ منجھلے بیٹے مختار عالم نے الیکٹرک انجینیئر نگ اور چھوٹے بیٹے سیف الاسلام کو میکانیکل انجینیئر نگ کروایا۔ میری دونوں بہنوں میں رشیدہ بیگم کو جہاں بی اے تک پہنچایا، وہیں چھوٹی بہن خورشید بیگم کا تعلیمی سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ انہوں نے اپنی شفقت محبت اور لگن سے اپنے اس بڑے بیٹے کو 'اختر علی' سے 'اختر آزاد' بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا سنگھرش سے بھرا پُرا جیون میرے لئے آج بھی 'آئیڈیل' ہے۔ تخلیق کا محرّک ہے۔

میری ادبی زندگی کو ایک نئی سمت میرے دوست ارمان شباب (جو اس وقت ابرار مجیب ہیں) نے دی۔ اُنہوں نے میرے ابتدائی افسانوں کو پڑھنے کے بعد میری کافی حوصلہ افزائی کی۔ سیّد احمد شمیم، جوہر بلیاوی اور ڈاکٹر منظر کاظمی (مرحوم) تعلیم کے مختلف مدارج میں میرے اچھّے استاد رہے ہیں۔ ادب سے لگاؤ کے باعث ان کی قربت میں آنے کا مجھے موقع ملا۔ اور میں نے اس موقع کا فائدہ اُٹھا کر ادب کو ادب کی نگاہ سے دیکھا اور ادب کو ادب سے سمجھا۔

منظر کلیم صاحب نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے میرے افسانوں کا انتخاب

کیا۔ پروفیسر ساغر برنی، جناب انور امام اور جناب تنویر اختر رومانی نے اس سلسلے میں مفید مشوروں سے نوازا۔ مہتاب عالم پرویز، ڈاکٹر اکبر علی اور اصغر امام اشک نے مسودہ تیار کرنے میں میری مدد کی۔ اس مجموعے کی اشاعت ۱۹۹۶ء میں ہی متوقع تھی۔ لیکن لاکھ کوشش کے باوجود عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکا۔ اس کے بعد بھی کئی بار پروگرام بنے اور بگڑے۔ اس سال کے وسط میں میرے عزیز دوست اسلم جمشید پوری جب دہلی سے جمشید پور تشریف لائے تو مجھ سے ملنے میرے گھر آئے۔ اور بات چیت کے دوران انھوں نے یہ کہتے ہوئے میرے ہاتھوں سے مسودہ چھین لیا۔ ''تم مسودہ تیار کر کے جب چار سال میں ایک مجموعہ شائع نہیں کرا پائے تو پھر اب میں اسے اپنے ساتھ دہلی لے جا رہا ہوں۔ دو تین ماہ کے اندر تمہارا یہ مجموعہ میری دیکھ ریکھ میں شائع ہو جائے گا۔'' اور اس طرح انھوں نے اپنی بے پناہ مصروفیت کے باوجود مسودہ سے کتاب تک کا مرحلہ تنہا طے کر کے دوستی کا حق ادا کر دیا۔

آج وقت کے اِس پڑاؤ پر ڈاکٹر منظر کاظمی (مرحوم) کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میرا قلم کانپ رہا ہے۔ منظر کاظمی نہ صرف میرے اکیڈمک اُستاد تھے بلکہ ادب کی تفہیم میں اُن کی رہنمائی ہمیشہ میرے ساتھ رہی۔ میری کتاب پر اُن کی تحریر اُن کی آخری تحریر ہے۔ مجھے ہمیشہ یہ افسوس رہے گا کہ کاش وہ موجود ہوتے اور میری کتاب پر اپنی تحریر دیکھ پاتے۔

جیسا کہ میں نے پہلے ہی عرض کیا ہے 'بابل کا مینار' میرے افسانے کا پہلا 'پڑاؤ' ہے۔ اور اس پڑاؤ تک پہنچنے کے لئے میں نے حرف حرف جوڑ کر لفظوں کا جو پُل بنایا ہے اور لفظ نُما کاغذی اینٹوں کو بالو اور سیمنٹ کی روشنائی سے جوڑ کر افسانوی 'پڑاؤ' کی جو تعمیر کی ہے۔ اس کا ایک بھی افسانہ اگر آپ کو پسند نہیں آیا، تب بھی ''قلم کا یہ مزدور'' اسی طرح مزدوری کرتا رہے گا۔ اور 'پڑاؤ' بنتے رہیں گے۔

۲۲ ستمبر ۲۰۰۰ء

اختر آزاد، جمشید پور

دوڑ

میری آنکھوں کی سیاہ پتلیوں کے کینوس پر جب مستقبل کی فلک بوس عمارت پاش پاش ہونے لگی، تب میں نے فیصلہ کیا تھا۔

میں بھی زندگی کی دوڑ جیتوں گا......!

جوانی کی رہگزر بڑی پُرخطر ہوتی ہے۔ انسان خود سے خوف زدہ رہتا ہے کہ کوئی غلطی طوفان کا پیش خیمہ نہ بن جائے۔ ایسے وقت میں تنہائی کی خلیج کو پاٹنے اور رہگزر سمیٹنے کے لئے اپنے اندر شریکِ سفر کی خواہش کون نہیں کرتا؟ جب میرے اندر بھی ایسی ہی خواہش کونپل کونپل چل کر جوان ہوئی تو مالتی ساتھ دینے کے لئے آگے بڑھی۔ پھر تین سال کے بعد دو ننّھے منّھے بچّے پرکاش اور رما ہماری زندگی میں دبے پاؤں آ گئے۔

میں جن راستوں پر چل رہا تھا، وہ مالتی کو پسند نہ تھا۔ قدم قدم پر بکھرے سنگ ریزے اس کے کومل پاؤں کو لہولہان کر رہے تھے۔ اس لئے مالتی جب کبھی سہیلی گھروں سے لوٹتی تو اُداس اُداس سی نظر آتی۔ جھنجھلا کر باتیں کرتی۔ کبھی یہ کہتی، کبھی وہ کہتی۔ وہ ٹھیک ہے اور یہ ٹھیک نہیں۔ اُس کے یہاں 'وہ' ہیا ور ہمارے یہاں تو 'وہ' تو کیا 'یہ' بھی نہیں ہے۔

میرے سمجھانے پر وہ اُلٹے برس پڑتی۔

''تم ٹیچر کی نوکری چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ ارے میں تو کہتی ہوں کہ جس پیشے

میں انسان گھُٹ گھُٹ کر زندگی جیتا ہے اسے چھوڑ دینا ہی اچھّا ہے۔''

پرکاش اور رما کی پاگلوں جیسی ضد پر جب میں انہیں قیمتی کھلونے لا کر نہیں دے پاتا تو مالتی کے تیور دیکھنے کے لائق ہوتے۔

''تمُہارا باپ تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ اب تم دونوں کے لئے لگتا ہے مجھے ہی بازار نکلنا پڑے گا۔''

میری آنکھوں کی سیاہ پتلیوں کے کینوس پر جب مستقبل کی فلک بوس عمارت پاش پاش ہونے لگی، تب میں نے سوچا تھا۔

میں بھی گھر سے نکلوں گا۔

زندگی کی دوڑ جیتنے.......

زندگی کے سمندری ساحل پر میں خوابوں کی سیپ چُن رہا تھا کہ میرے اندر کا میں اپنی حیران کُن آنکھیں لئے میرے سامنے آ گیا۔

''اس پروفیشن میں عزّت آسمان کی طرح پھیلی ہوئی ہے اور تم اسے چھوڑ کر جا رہے ہو۔ ذرا سوچو! تم ایک ریگولر ٹیچر ہو۔ ہزار دو ہزار میں گھر والوں کو روکھی سوکھی ہی سہی عزّت کی دو روٹیاں تو کھلا ہی سکتے ہو۔''

وہ سمجھانے کے انداز میں کہتا رہا.......

''اپنے گھر سے دور سمندر پار تنہائی کے ساحل پر سُنہری خوابوں کے جال بُننا قبل از وقت سرور بخش ہوتا ہے۔ لیکن مستقبل......؟ میرا خواب ہی میرا مستقبل ہے، اور مستقبل میری زندگی۔''

''یہ تمُہارا اٹل فیصلہ ہے......؟''

''ہاں!''

''تو جاؤ! وہاں ایک سنہری زندگی تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ لیکن سورج ڈوبنے سے پہلے گھر لوٹ آنا تاکہ وقت کا آئینہ تمہیں پہچان سکے۔''

جمشید پور سے بمبئی میری دوڑ کی پہلی منزل تلخ تجربات سے بھری پڑی ہے۔ میں تھک گیا تھا۔ میرا وجود لہولہان ہو چکا تھا۔ میری قوّتِ رفتار جواب دے چکی تھی۔ لیکن میں رُکا نہیں۔ سرور باطن کی لہر تھکاوٹ کے احساس سے پرے، مجھے حسین خوابوں کے سنہرے دروازے دکھا رہی تھی اور میں نشے میں چور کبھی آہستہ اور کبھی تھم تھم کر بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

شہر بمبئی کی فلک بوس عمارتوں کو چھوتی ہوئی میری آنکھیں اور چوڑی، چکنی، کالی سڑک پر دوڑتا ہوا میں دُنیا سے بےخبر اپنی ہی دوڑ میں مگن تھا۔

بمبئی سے دوبئی میری دوڑ کی دوسری منزل جان لیوا اور اُکتا دینے والی اس دوڑ میں، میں بار بار تھکتا، اور دوڑتا رہا تھا۔ میں وقت کے دوش پر سوار گئی ملکوں کے سروں کو روندتا ہوا امریکہ پہنچا۔ واشنگٹن کے بارے میں صرف پڑھا اور سُنا تھا۔ دیکھنے کا اتفاق پہلی بار ہوا۔

زندگی کا طواف کرتے کرتے بالآخر ایک دن احساس کی چنگاری میرے اندر سُلگ اُٹھی۔ میں بے چین ہو اٹھا۔ اس لئے کہ وقت کا ڈوبتا ہوا سورج مجھے اپنی زندگی کی آخری کہانی سنا رہا تھا اور رات کے قدموں کی چاپ میں اپنی پشت پر صاف سن رہا تھا۔ تھکن سے جسم چور چور تھا۔ میں رُکنا چاہتا تھا۔ لیکن اگر میں رُک جاتا تو اپنی زندگی کا آخری دن کیسے دیکھ پاتا۔

اس لئے میں رُکا نہیں، پتھریلی اور کٹیلی سڑکوں پر دوڑتا ہی رہا۔ دوڑتے دوڑتے پندرہ سال پندرہ سال گزر گئے۔ اور میں دوڑ کے اس طویل مقابلے میں وہاں پہنچ گیا جہاں سے دوڑ کی شروعات کی تھی۔ اس لئے آج میں بہت خوش تھا۔

جمشید پور ائیر پورٹ پر اُترتے ہی میری آنکھیں اِدھر اُدھر جانے انجانے چہروں کی تلاش میں انجان چہروں کی کتابیں پڑھتی رہیں ____ لیکن ایک لمبی دوڑ جیتنے کے بعد میرا

استقبال شاندار طریقے سے ہوا۔ اور میں خوشی کے مارے ویٹنگ روم میں گھنٹوں بیٹھا رہا۔ چُپ چاپ اور خاموش آنکھیں پھیلائے.......

اس وقت میں خود کو یہ تسلّی دے رہا تھا کہ میری اچانک آمد ہی اپنوں کے لئے ایک سرپرائز ہوگی۔اور جب ٹیکسی رُکی تو میری آنکھوں میں آسمان جھُک گیا تھا۔میری ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی کی جگہ بنی عالی شان عمارت نے مجھے بہت چھوٹا کر دیا تھا۔

کال بیل پر انگلی رکھتے ہی دروازہ کھلا۔مالتی سامنے کھڑی تھی۔

''آپ کون ہیں......کس سے کام ہے.......؟''

میں حیران تھا......

پرکاش یا رما کس سے ملنا ہے۔وہ عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ دونوں میں سے کوئی بھی اس وقت گھر پر نہیں ہے۔'' وہ دروازہ کی طرف مڑ گئی۔مڑتے مڑتے رُکی۔پھر بولی۔''کیا نام ہے آپ کا......؟''

''مالتی......!'' میرے پاؤں سے جیسے ہی زمین نکلنے لگی،میرے اندر کی چیخ خود بخود باہر چلی آئی۔

''میں ہوں.......میں......تمہارا آکاش.......!''

اور وہ اس طرح مان گئی جیسے سامان کی خرید وفروخت میں لوگ اونچے نیچے دام پر سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔

پورے پندرہ سال کے بعد آئے ہو۔اور اب تو تمہارے بال بھی سفید ہو چکے ہیں۔جب تم یہاں سے گئے تھے تو بالکل جوان تھے۔''

وہ میرے ہاتھ سے بریف کیس لے کر مجھے راستہ دکھانے لگی تھی۔

ڈرائنگ روم کو مالتی نے کچھ اس ترتیب سے سجا رکھا تھا جیسے در و دیوار کو حسن کی زبان مل گئی ہو۔بے صوت و بے صدا۔مگر دعوتِ لمس ونظر دیتی ہوئی۔

مالتی نے ہی بتایا.......

پرکاش اور رما کالج کے بعد کلب میں وقت دیتے ہیں۔وہ بھی تنہائی کے ساحل پر موتی چننا پسند نہیں کرتی۔اُسے سمندری لہروں کے ساتھ آنکھ مچولی کا کھیل اچھا لگتا ہے۔کچھ دیر قبل ہی کلب سے لوٹی تھی۔فلم دیکھنے کا پروگرام بنا بنایا تھا۔تھوڑی دیر بعد وہ بھی نہیں مل

پاتی۔ خط مل گیا تھا۔ لیکن پرکاش اور رما نے یہ کہہ کر بات کا گلا گھونٹ دیا تھا کہ ڈیڈی کوئی دودھ پیتا بچہ تو نہیں، جو ائیر پورٹ سے آتے آتے کہیں راستے میں کھو جائیں گے۔ اور بھلا مالتی کیسے آتی؟ اُس کے کلب میں ایک ضروری میٹنگ تھی۔

میں اوراقِ ماضی میں گم، وقت سے بچوں کے نقوش مانگ رہا تھا کہ نوکرانی چائے کی ٹرے سنبھالے سامنے آ گئی۔ پھر میرے پاس سے گزر کر مالتی کے بالکل قریب پہنچ گئی۔

''میری چائے لے جاؤ۔ میں اِس وقت جلدی میں ہوں۔''

قد آدم آئینے کے روبرو یہ کہتی ہوئی مالتی مجھے بہت اچھی لگی تھی۔ کار رکنے اور گیٹ کُھلنے کی ملی جلی آواز نے میری نظر کو دروازے کی طرف موڑ دیا۔ مالتی بالوں کو کنگھی دکھانے کے درمیان بول پڑی۔

''پرکاش آیا ہے۔''

میری موجودگی سے بے خبر پرکاش ایک لڑکی کے ہمراہ ڈرائنگ روم میں چلا آیا۔

''ممی مجھے پانچ ہزار روپے کی ابھی ضرورت ہے۔ میں چاندنی کے ہمراہ کالج کے انوول ٹور پر کشمیر جا رہا ہوں۔ دس پندرہ دنوں میں لوٹ آؤں گا۔''

اُلّو کہیں کا......! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ جا الماری سے نکال لے۔''

مالتی نے اُسے اس انداز میں کہا جیسے اُس نے پوچھ کر کوئی گُناہ کیا ہو۔

پرکاش نے مسکراتے ہوئے چاندنی کی طرف یوں دیکھا جیسے اس کی آنکھیں کہہ رہی ہوں۔ دیکھا نا چاندنی! میری ممّی اس معاملے میں کتنی اچھی ہیں۔ اور پھر وہ دوسرے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اُس وقت مجھے ایسا لگا کہ جیسے میرے جسم سے میری روح کوئی چھین رہا ہے۔ اور تب میں اُسے پکڑنے کے لئے لفظوں کی سڑک پر آواز کے سہارے آگے بڑھ گیا۔

''بیٹا پرکاش......!'' میری آواز پر اُس کے بڑھتے قدم اسی طرح رک گئے جیسے میں نے ''بیٹا'' نہیں بلکہ سڑی گالی دی ہو۔

''اکاش یقین جانو تم کافی بوڑھے ہو چکے ہو۔ اس لئے پرکاش......؟''

پرکاش کو اپنی تمنّا کی بانہوں میں بھینچ کر میں ماضی کی طرف لوٹنے ہی والا تھا۔ پندرہ سال کی پیاسی محبت جو اس کے لئے تھی، لمحات کی پیالی میں بھر کر ابھی اُسے پلانے ہی والا تھا کہ پرکاش کی دوست لڑکی بول پڑی۔

''چلو بھی پرکاش دیر ہو رہی ہے۔ دس پندرہ دنوں کے بعد جب لوٹو گے تو خوب جی بھر کر ملنا''۔ اس طرح پرکاش کی چاندنی ایک باپ کو محرومی کے اندھیروں میں چھوڑ گئی۔

اُس وقت میں رو کہاں رہا تھا۔ اور اگر روتا تو آنکھ کی کٹوری کے آنسو کون نہیں دیکھتا......؟ اور میں اتنا پاگل بھی کہاں تھا: جو ایک چھوٹی سی بات پر اس لئے رو دیتا کہ جس کی تمنا میں پندرہ سال بعد لوٹا تھا۔ جس کے لئے سب کچھ کیا تھا۔ اُسے جی بھر کر پیار کیوں نہ کر سکا۔

ایسے بہت سارے سوالوں نے مل کر میری نظر کو مالتی کی طرف موڑ دیا۔

وہ ڈریسنگ ٹیبل کے روبرو خود کو ہر زاویے سے دیکھ رہی تھی۔ سجا رہی تھی۔ سنوار رہی تھی۔ حرکات و سکنات میں نئی نویلی دُلہن سمٹ آئی تھی۔ کوئی بھی ایسے وقت میں اُسے دیکھنے کی کوشش کرتا۔ میں بھی اُسے دیکھتا رہا تھا......سمندر کی ویسی ہی گہرائی۔ موجوں کی ویسی ہی ہلچل اس کے اندرون میں مجھے نظر آئی۔ اور میں خود کو دائرے میں سمٹتا ہوا دیکھنے لگا۔ لیکن اُس وقت اس نے یہ کہہ کر میرا ہاتھ جھٹک دیا۔

''چھوڑو بھی آکاش! میرے بال خراب ہو رہے ہیں۔''

سورج ڈوبتا ہے۔ مگر ڈوبنے کے بعد بھی شفق چھوڑ جاتا ہے۔ لیکن کمپیوٹر کے اس دور میں کسی کے پاس اگر وقت نہ ہو تو اس میں مالتی کا کیا قصور۔

........اور جب میں نے یادوں کے البم سے اُس لڑکی کو ملایا، جو ابھی ابھی اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ قدم بہ قدم ڈرائنگ روم تک آئی تھی، وہ رما ہی تھی۔

مگر وہ میری رما کہاں تھی؟ جسے میں چھوڑ گیا۔

مجھ جیسے بدصورت بوڑھے کو اپنے خوش رنگ ڈرائنگ روم میں پا کر رما ہی کیا: رما جیسی کسی

بھی لڑکی کے چہرے پر ناخوشگواری کی ریت بکھر سکتی ہے ۔ کچھ کہنے سننے کا میں خواہاں تھا۔ مالتی بھی میرے متعلق شاید کچھ بتانا چاہتی تھی۔لیکن مالتی نے کچھ کہا اور نہ میں ہی بتا سکا کہ کون ہوں۔

''یہ بوڑھا یہاں کیا کرنے آیا ہے......؟''

رما نے تلخ لہجے میں پوچھ کر کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔جس کا احساس مالتی کو بھی تھا۔ جواُس کے چہرے کی لکیروں سے صاف عیاں تھا۔

''یہ تمہارے ڈیڈی ہیں بیٹی۔''

کچھ یاد کرتے ہوئے......''ارے میں تو بھول گئی تھی کہ آج ڈیڈی آنے والے ہیں۔'' رما میرے قریب آ گئی تھی۔

'' کیسے ہیں ڈیڈی؟ کب آئے؟''

کیسے اور کب کے جواب کے لئے ابھی ہونٹ تیار بھی نہیں ہوئے تھے کہ رما بوائے فرینڈ کے اشارے پر بول پڑی۔

ڈیڈی! آج کلب میں ڈانس کا شو ہے۔میں نے بھی حصہ لیا ہے۔یہ ڈریس جان کر پسند نہیں ہے۔اس لئے سوچی بدل لوں۔رات یہی کوئی بارہ ایک تک لوٹ آؤں گی۔''

رما اتنے باریک کپڑوں میں باہر نکلی،جس کے اندر سے لگ بھگ پوری عورت جھانک رہی تھی۔شرم سے میرا چہرہ جھک گیا۔لیکن وہ مسکراتی ہوئی،بائی بائی کرتی ہوئی اُس لڑکے کے ساتھ باہر چلی۔

رما کے جاتے ہی کمرے میں دھواں سا بھرنے لگا تھا۔اور میں اس دھواں آلو د ماحول میں خود کو آہستہ آہستہ گُم ہوتا ہوا دیکھا رہا۔تاریکی سے نکل کر بھاگنے کی کوشش میں،میں کافی دیر تک ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔لیکن جب بری طرح تھک گیا۔تب میں نے سوال کیا۔

''میں کہاں ہوں؟''

مالتی چپ رہی تھی.......

''کہاں ہوں میں.......؟''میں نے اِدھر اُدھر ہاتھ بڑھا کر خود کو ڈھونڈ نا چاہا۔

مالتی اس بار بھی چپ رہی تھی۔

''کچھ کہتی کیوں نہیں.......؟''اچانک اُس کے خوشبودار بوائے کٹ بال میری مُٹھّی میں آ کر پھڑ پھڑانے لگے تھے۔اور میں چیختا رہا۔

''تم نے میرے خوابوں کے ساتھ بلاتکار کیا ہے۔تم نے پرکاش اور رما کی زندگی کے ساتھ بھی گھناؤنا کھیل کھیلا ہے۔

''میں نے........؟''ایک ہی جھٹکے میں مالتی اپنے بال چھڑا لیتی ہے۔

''ہاں تم نے.......تم نے.......''

''ارے آج بھی تمہاری آنکھیں بند ہیں۔''

آواز کا ایک زوردار وار مالتی مجھ پر کرتی ہے۔

''تم آج بھی وہیں ہو، جہاں تھے۔پندرہ سال میں ماحول نے کتنے رنگ بدلے ہیں۔کتنی کروٹیں لی ہیں۔تمہیں کیا پتا۔دو چار دن کے بعد خود جان جاؤ گے کہ موڈرن دور کی سوسائٹی میں عزت،شہرت اور اسٹیٹس کیا چیز ہے؟''تیور بدل کر۔''اور مسٹر رہی فرینڈ شپ کی بات تو آج جان لو کہ یہی موڈرن سوسائٹی کی پکار ہے۔''

''اور ہاں!ساتھ گھومنے پھرنے میں رکھا ہی کیا ہے؟''

''پھر تم جہاں سے آرہے ہو وہاں......؟''

مالتی کے اس طنز بھرے سوالوں کا اُس وقت میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔اِس لئے چپ رہا۔

''چپ کیوں ہو گئے.......؟''

اس کے پتھریلے جملے سے میری روح کا آئینہ چٹخ گیا۔لیکن اِس بار اس کے سوال کا میرے پاس پورا جواب تھا۔

''تڑاخ......!''

اس وقت میں غصّے سے کانپ رہا تھا۔اور وہ مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھے جارہی تھی۔ پھر وہ مجھ پر جھپٹ پڑی اور میری قمیص کا کالر پکڑ کر چلاّ نا شروع کر دیا۔

''مجھے سمجھ کیا رکھا ہے......؟'' مالتی کی آنکھیں سرخ اور گول ہو کر باہر نکل گئی تھیں۔آواز میں طوفان کا شور تھا۔

''آ کاش!تم نے بیسویں صدی کی سڑک پر بیسویں صدی کی دوڑ جیتی ہے۔لیکن تمہارے بچوں کو اکیسویں صدی کی دوڑ میں شامل ہونا ہے۔سمجھے!''

مالتی کی اس بات پر میں بھونچکا رہ گیا۔ کیونکہ جب میں گھر سے باہر نکلا تھا تو سوچا تھا: کہ اپنی صدی سے آگے، بہت آگے نکلوں گا۔اور ایسا ہوا بھی۔لیکن......''

ٹرن.....ٹرن.......ٹرن.......

ہوا کی سڑک پر چل کر آواز ڈرائنگ روم کے زینے پار کر گئی تھی۔ مالتی نے اس آواز پر میری قمیص کا کالر اس طرح چھوڑ دیا جیسے وہ بٹن ٹانک رہی تھی۔ چہرے کا رنگ بھی یکا یک غائب ہو گیا تھا۔ایسا لگ رہا تھا جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو۔اور وہ کھڑکی کا ریشمی پردہ سرکا کر جھک اُٹھی تھی۔

''اوہ!ایس۔ڈی۔او صاحب آ گئے۔''

ہونٹوں کے پھیلنے اور سکڑنے سے پنکھڑی لب کی لالی پر حرف آ گیا تھا۔اور تڑاخ کے پانچ نشان سے مالتی کے رخسار کی تازگی کہیں کھو گئی تھی۔اس لئے وہ دوبارہ ڈریسنگ ٹیبل پر بیٹھی۔آئینے کے مقابل سراپا کیا۔جلدی جلدی رخسار ولب سنوارے۔منی پرس اُٹھایا اور دروازے کی طرف تیزی سے بڑھ گئی۔ یکا یک سوچتی ہوئی رُکی، مُڑی اور دروازے سے اندر جھانکتے ہوئے آواز لگائی۔

''اُرملا!''

مالتی کی آواز پر نوکرانی اندر کے کمرے سے دوڑی چلی آئی۔

''کیا ہے مالکن......؟'' نوکرانی نے آتے ہی کہا۔

''میں فلم جارہی ہوں۔گھر کا تم ذرا خیال رکھنا۔سمجھی......!''

بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کا کام لیتے ہوئے اُس وقت وہ مجھے چڑیل لگ رہی تھی۔ پھر وہ میری طرف مڑی اور اپنی چمکدار آنکھوں کی گولیاں نچا کو بولی۔ مردوں طرح جو گھر سے باہر نکلتے وقت بیوی سے یونہی کہہ جاتا ہے۔

'' بھوک لگے تو کھانا کھا لینا۔ میرا انتظار مت کرنا۔ رات یہی دس گیارہ تک.......ارے چھوڑو میرا کوئی ٹھکانا نہیں کب لوٹوں گی۔ سمجھے......؟''

پھر اونچی ہیل کی کھٹ کھٹ کے ساتھ وہ سیڑھیاں اُتر گی۔ تب میں نے سوچا یہ جب اس دوڑ میں 'آج' اتنے آگے نکل چکے ہیں تو پتا نہیں 'کل' کمپیوٹر پر انسان اپنی کسی پہچان کے ساتھ

اُبھرے گا.......؟

تجربات کے اس گھنے جنگل میں جب سوچ کا دائرہ پھیلا تو میری آنکھیں کمرے کے کونے میں رکھی ہوئی دونالی بندوق سے جاٹکرائیں۔

آج میں ایک ٹانگ کا بھی ہو کر خوش ہوں۔

☆☆☆

انوکھا شہر

امیرِ شہر منچ پر کھڑے تھے۔

''بھائیو! اس شہر کے قیام کا مقصد ایک انوکھا شہر بنانا تھا، لیکن آج برسوں بیت گئے ہیں اور غریب آج بھی گلی کوچوں، سڑکوں، میدانوں اور ہمارے محلوں کے سامنے چلتے پھرتے، دوڑتے کودتے، ناچتے گاتے، ہنستے مسکراتے، بھوک سے چلاّتے اور کشکول ہلاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔''

بھائیو! اس سے پہلے کہ یہ شہر غلاظت کے ڈھیر میں دب کر قصّہ پارینہ بن جائے، ہمیں چاہیئے کہ ایسے لوگوں کو شہر بدر کر دیا جائے جو غلاظت بڑھانے میں مصروف ہیں۔''

''کیا تم سب ایسا نہیں چاہتے؟''

''مجمع پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے امیرِ شہر نے جب لوگوں کے جذبات کو بھڑکایا تو مجمع بھی چیخ اُٹھا۔

''ہم سب ایسا ہی چاہتے ہیں۔''

''تو پھر دیر کس بات کی؟ اس غلاظت کو شہر بدر کرنے کی فوراً کوئی تدبیر سوچو، ورنہ بھگوان کی طرف سے دیا گیا عذاب ہم سب کی کوکھ میں پلنے لگا۔''

امیرِ شہر کی ان باتوں کو کچھ نے ڈر

سے مان لیا۔ کچھ نے خدا کا درجہ دیا تو دل سے ماننا پڑا۔ پھر ہونا کیا تھا: دوسرے ہی دن سے ''رِچ گارڈن'' کے چھوٹے چھوٹے بورڈ ز کو بڑے سائز میں تبدیل کرنے کا کام زور وشور سے شروع ہو گیا۔ شہر کے چوراہوں پر سُنہری حرفوں سے ''رِچ گارڈن'' لکھا گیا۔ پرانے نام ''غریب نگر'' جو چوراہوں پر مختلف رنگوں سے لکھے گئے تھے اس پر تارکول پوت دیا گیا۔ جگہ بہ جگہ لگے ہوئے غریب نگر کے بورڈ کو اُ کھاڑ پھینکا گیا۔

''غریب نگر! سالا یہ بھی کوئی نام ہے؟''

''ہے نہیں! تھا، اب تو یہ رِچ گارڈن ہے۔''

''ہا۔ہا۔ہا''

شہر میں کھلبلی مچ گئی۔ غریبوں نے احتجاج کیا کہ یہ نام ان کے پرکھوں کے رکھے ہوئے ہیں۔ بدلا نہیں جائے۔ تب کئی ایک کے سر پھٹے۔ کئی کی ٹانگیں ٹوٹیں اور کئی ایک کو آسمان نگل گیا۔

ایک ہفتہ تک یہ لڑائی جاری رہی تھی۔ آخر کار وقت کے بدلتے ہوئے تیور کے در پر غریبوں نے اپنا سر، سردار کے کہنے پر رکھ دیا کہ نام میں کیا رکھا ہے۔ بدلتا ہے بدل جائے۔ نام کے بدلنے سے جس طرح انسان نہیں بدلتا، اسی طرح یہ شہر بھی ہم سب کا ہے اور کل بھی رہے گا۔

لیکن جب کل آیا تو لوگوں نے دیکھا کہ اس کے سردار بک چکے ہیں اور سب بڑی بڑی عمارتوں میں دوسری جگہ منتقل ہو رہے ہیں۔ لوگوں نے روکنا چاہا تو انہیں یہ کہہ کر بہلایا گی۔ ''یہ سب کچھ پگلے! تم سب کے لئے ہی تو کر رہے ہیں۔ بعض احتجاجیوں کو بڑے کاموں سے جوڑ دیا گیا یا پھر ان کے عہدے بڑھا دیئے گئے۔ کچھ ایسے لوگ جن کے پاس طاقت تھی یا پھر ویسے لوگ جو تھوڑی عقل رکھتے تھے، انہیں یو تو خرید لیا گیا یا اچھّی نوکری دے کر اپنا ہم نوا بنا لیا گیا تا کہ بغاوت کا علم ہمیشہ جھکا رہے۔

لیکن یہ مسئلے کا حل نہیں تھا کہ روز مرّہ کی زندگی میں کچھ کام ایسے ہیں جنہیں صرف غریب ہی کر سکتے ہیں۔ اس لئے کچھ غریب مزدوروں کا سہارا لینا ضروری تھا۔ ایسے

ہی مزدوروں کے لئے جگہ جگہ دکانیں بنوا کر ان کا محنتانہ دُگنا، تین گُنا اور یہاں تک کہ کچھ کا دس گُنا کر دیا گیا تا کہ وہ سب بھی جلد سے جلد امیروں کی صف میں کھڑے ہونے کے لائق ہو جائیں۔

اور ایسا ہوا بھی!

اور ایسا بھی ہوا کہ شہر کے وہ چوراہے جہاں مزدور روٹی کے لئے سورج کے ساتھ طلوع ہو جایا کرتے تھے۔ گھروں اور میدانوں میں، سڑکوں اور دکانوں میں اپنے لہو کو دھوپ کی چادر سُکھا کر شام ڈھلے نیم مردہ حالت میں گھر لوٹا کرتے تھے۔ تب کہیں جا کر گھر میں آگ سلگتی تھی۔ پیٹ کی آگ بجھتی تھی۔

لیکن آج اُنہی چوراہوں سے اُنہیں نفرت سی ہو گئی تھی کہ اب کوئی کار ان چوراہوں پر آ کر نہیں رُکا کرتی تھی۔ پیٹ کی آگ کی خاطر چوراہے بدلے گئے۔ لیکن وہاں بھی ان کے بھائی وہی بھوگ رہے تھے۔ آخر کار زندگی سے لبریز چوراہوں کی تلاش میں کچھ دن اور سرگرداں رہے۔ پھر کچھ نا اُمید ہو کر ہمیشہ کے لئے دوسرے شہر کا رُخ کیا اور اپنے آپ کو وہاں کے چاروں کھونٹ سے باندھ کر ''غریب نگر'' کو بھولنے کی ناکام کوشش میں جُٹ گئے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو ماہانہ اُجرت پر اپنا لہو بیچ رہے تھے۔ ایسے لوگوں پر بھی نئے دور کی نئی نئی غیر ملکی مشینوں نے ہزاروں ہزار مزروروں کا کام خود کر کے ہزاروں کے ہاتھ قلم کر دیئے۔

ایسے میں مزدوروں کی زندگی ایک کھلونا بن کر رہ گئی تھی۔ مزدور جب ہڑتال کی طرف بڑھے تو اس کے بدلے میں بھوک افلاس اور چند ایک کو موت کے سوا کچھ نہ ملا۔ کچھ ہی ماہ کے بعد ہڑتال خود بخود ختم ہو گئی کہ زیادہ تر مزدور دوسرے شہروں کی طرف اُڑنے کے لئے پر تول رہے تھے۔

امیرِ شہر کا قہر جاری تھا اور کچھ سخت دل انسان اڑے ہوئے تھے۔

''ہم یہیں پیدا ہوئے ہیں۔ یہیں مریں گے۔ غریب نگر ہمارا ہے۔''

امیرِ شہر کے حکم پر پہلے شہر کے غریبوں کی ایک لسٹ بنائی گئی۔ اسے تیّار کرنے میں

شہر کے تمام ذی رُتبہ اشخاص نے شمولیت کا شرف حاصل کیا۔ پھر آگے کا کام اس طرح جاری رہا کہ پہلے لوگوں نے اپنے اپنے گھروں سے نوکروں کو نکال باہر کیا۔ کرائے کی گاڑیوں پر بیٹھنا چھوڑ دیا۔ کچھ کے پاس کار نہیں تھی تو انہوں نے کار خرید لی۔ کچھ کو زبردستی خریدوائی گئی۔ کچھ تیز رفتار سڑک سے ڈرتے تھے، اُنہیں بیچ سڑک پر اسٹیرنگ تھمایا گیا۔ آرام پسندوں سے زبردستی کام کروایا گیا۔

امیرِ شہر کے حکم کی خلاف ورزی کرنا موت کو بُلانا تھا۔ لیکن عورتیں بھلا کب ماننے والی تھیں۔ احتجاج کرتی رہیں۔

''ہمارے کپڑے کون دھوئے گا؟''

''برتن کون صاف کرے گا؟''

''گھر کی صفائی کون کرے گا؟''

''بچّے کون کھلائے گا؟ کھانا کون پکائے گا؟''

''اور یہ کام کون کرے گا.........؟''

''اور وہ کام کون کرے گا.........؟

امیر شہر کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو وہ ان کے شوہروں پر ٹوٹ پڑے۔ ''تم سب ہجڑے ہو۔ اپنی عورتوں کو نہیں سمجھا سکتے؟ اگر خود سے کام نہیں ہوتا تو جاؤ۔ ابھی اور اسی وقت روبورٹ خرید لاؤ۔ کل سے ہمارا سارا کام روبورٹ ہی کیا کریں گے۔''

لیکن عورتوں کا احتجاج جاری تھا۔

''نہیں روبورٹ ہر کام نہیں کرسکتا۔''

''بے وقوف مت بنو۔ امیرِ شہر کا حکم ہے اور پھر روبورٹ آج کے انسانوں سے بہتر اور کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کام کرسکتا ہے ورنہ........''

پھر گھر گھر روبورٹ چلتے پھرتے اور دوڑتے نظر آنے لگے۔ گھر کے کاموں میں وہ عورتوں کا ہاتھ بٹایا کرتے۔ باہر کا کام بھی وہ دیکھ لیا کرتے۔ لیکن درد کا وہ میٹھا لمحہ جب اُن کی شریانوں میں دوڑنے لگتا تو عورتوں کو زندہ انگلیوں کا لمس بہت یاد آتا۔ اس وقت امیرِ شہر

کو عورتیں دل ہی دل میں کوسا کرتیں۔

شہر میں کچھ ایسے غریب رہ گئے تھے جو چھوٹی چھوٹی دکانیں چلا رہے تھے۔ پہلے انہیں شہر چھوڑنے کے لئے کہا گیا۔ جب نہیں مانے تب دھمکی دی گئی۔ کچھ کو مار ڈالا گیا۔ کچھ کی دکانیں جلا دی گئیں۔ کچھ کے مال کی سپلائی مہاجنوں سے کہہ کر بند کروا دی گئی۔ آخر کار بے چارے خون کے آنسو لئے شہر سے باہر چلے گئے۔

اب بھی شہر غریبوں سے خالی نہیں ہوا تھا۔ کچھ ایسے بھی تھے جو اس شہر کی خاک سے بنے تھے۔ خاک میں ہی پلے تھے۔ وہ زندگی کا آخری لہو یہیں نچوڑ دینا چاہتے تھے۔ اس لئے اڑے رہے کہ جب تک سانس ہے یہ شہر ہمارا ہے۔

''کیا کہا، شہر تُمہارا ہے؟''

''نہیں تیرے باپ کا ہے۔''

''سالے زبان لڑاتا ہے؟''

پھر ایک ایک کو پکڑ کر وہ دھُنائی کی گئی کہ درد سے انگ انگ چیخ گیا۔ کچھ اسی رات بھاگ گئے۔ جو بھاگنے کے لائق نہیں تھے اُنہیں بسوں میں بھر بھر کر دور دراز کے علاقوں میں چھوڑ آیا گیا، جہاں ان کے دوسرے بھائی جھونپڑیاں ڈالے ہوئے تھے۔ کچھ ضدّی قسم کے لوگوں پر کئی طرح کے الزام لگا کر اُنہیں جیل میں ڈال دیا گیا۔

امیرِ شہر منچ کھڑے تھے۔

''یہ شہر دُنیا کا اب واحد شہر ہے، جہاں ایک بھی غریب نہیں ہے۔ اب اسے دُلہن کی طرح سجایا جائے۔''

''رِچ گارڈن'' کو دُلہن بنانے کا یہ منصوبہ دس سالہ تھا۔ جسے بڑی محنت و مشقّت اور جانفسانی کے بعد ترتیب دیا گیا۔ پھر کیا تھا: غریبوں کی بستیوں کو بلڈوزر سے روندڈالا گیا۔ سڑکیں چوڑی کی گئیں۔ اتنی چوڑی کہ کئی گاڑیاں ایک ساتھ آ جا سکیں۔ سڑکوں کے دونوں جانب خوبصورت پیڑ لگائے گئے۔ نالیوں کا انڈر گراؤنڈ انتظام کیا گیا۔ روشنی کا ایسا نظارہ کہ دن رات کا امتیاز جاتا رہا۔ لیمپ پوسٹ پر پینٹنگ کا ایسا نمونہ پیش کیا گیا کہ کائنات وہاں

اپنا چہرہ دیکھنے اُترا کرتی۔ سڑکوں کے کنارے جگہ بہ جگہ ایسے پارک بنوائے گئے تھے کہ دیکھنے سے ایسا لگتا تھا جیسے ہر پارک جنّت کا کوئی حسین گوشہ ہو۔ گول چکّروں میں زندگی کا نیا حُسن نظر آتا تھا۔ جہاں نئے طرز کے فوارے لگے ہوئے تھے جو روح کو گدگداز کرتے تھے۔ عمارتیں ایسی ایسی اور وہ بھی اتنی اونچی اونچی کی نظر رکھتے ہی پھسل جانے کا ڈر ہوتا اور عمارتوں کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا کہ کون سب سے اچھّی ہے وہ اتنا ہی مشکل تھا جتنا کہ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر کسی سے کوئی یہ پوچھے کہ یہ اچھا لگ رہا ہے یا یہ.......؟

دس سالہ پلان نے رِچ گارڈن کو ایسی دُلہن بنایا کہ دور دراز والے اس کے حُسن کو دیکھنے کے لئے پیسوں پر چل کر آیا کرتے تھے جو نہیں آپاتے، ترس کر رہ جاتے۔ مارکیٹ سے اس کی تصویریں خرید کر ڈرائنگ روم میں سجاتے۔ بچّہ بچّہ اس کے نام سے واقع تھا۔ ہر بچّہ اپنے والدین سے پوچھا کرتا۔ ''رِچ گارڈن'' یہاں سے کتنی دور ہے پاپا؟ ہم لوگ اُسے دیکھنے کب جائیں گے؟''

رِچ گارڈن اپنے نام کی طرح رِچ بھی تھا۔ اس لئے وہاں غریبوں کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ لیکن ایک دہائی سے پہلے والے غریب آج بھی موجود تھے جو یہاں کے حالات سے ایڈجسٹ کر گئے تھے یا کر دیئے گئے تھے۔ ان میں سے کئی ایک کا شمار آج کل شہر کے رئیسوں میں ہونے لگا تھا۔

انوکھے شہر کی تیز رفتاری دیکھنے کے لائق تھی۔ یہاں سب کے سب اپنے آپ میں مگن تھے۔ کسی کو کسی سے کوئی مطلب نہیں تھا۔ اب کوئی ہاتھ پھیلائے ہوئے ان کے پاس نہیں آیا کرتا۔ لیکن وہ پھر بھی اس انتظار میں دروازہ کھلا رکھتے تھے کہ کوئی آئے گا۔ وہ لوگ اپنے آپ میں اتنے مصروف ہو گئے تھے کہ ان کی اپنی زندگی کٹ کر رہ گئی تھی لیکن پھر سماج کی کچھ رسمیں ایسی تھیں جس کے تحت کئی گھرانے، کئی علاقے والے اور کئی پیشے والے ایک ساتھ مل بیٹھتے تھے۔ یہاں بھی امیروں کی اس بھیڑ میں ہر کوئی اپنی عزّت کا بھوکا ہوتا۔ سب یہی چاہتے تھے کہ لوگ اس سے بات کریں۔ اس کی بات کریں۔ اسے کی بات سُنیں۔ لیکن ایسا ممکن اس نہیں تھا کہ سب کے سب اونچی ایڑیوں کے سہارے قد آور ہو گئے تھے۔

کل جب وہ اپنے گھروں سے نکلا کرتے تھے تو ضرورت مند ہر روز ان کا راستہ روک لیا کرتے تھے۔ دن کے وقت گھروں میں پکڑ لینا اور آدھی رات کو نیند میں خلل ڈالنے کے علاوہ جیسے ان غریبوں نے کچھ سیکھا ہی نہیں تھا۔

''مالک۔ مالک! ہمار بیٹوا بیمار بھیئیو۔ دوائی کے لئے اُو ڈاکٹر وا پچاس روپیّا مانگت ہے مالک۔ کام کرت تو ہار چُکتا کر دیب مالک۔''

'' حجور! ہمری بڑکی بٹیا کی اگلے ماہوا سدیا ہے حجور۔ ہمرا کے ایک ہجار ایڈھانس چاہئے حجور۔''

''سرکار ہم غریب لوگ ہیں۔ کئی دن سے کام ڈھونڈ رہے ہیں۔ کوئی کام دے دیں۔ بھگوان آپ کا بھلا کرے گا۔''

لیکن اب ان میروں کے سامنے نہ کوئی ہاتھ باندھے، نہ ہاتھ جوڑے، نہ پیر پکڑے، نہ سر جھکائے اور نہ ہی آنکھوں میں آنسو لئے کھڑا رہتا تھا اور نہ ہی زندگی کے لئے کوئی فریاد ہی کرتا تھا۔ پہلے کی رئیسانہ زندگی یاد آتے ہی وہ سب عش عش کر اُٹھتے تھے۔ حالاں کہ پہلے کی بہ نسبت آج ان کے پاس کیا نہیں تھا لیکن کوئی نہیں آتا؟ اور جب کبھی کوئی خواب میں ان کے پاؤں سے لپٹ جاتا، روتا اور گڑگڑاتا.......پھر......جب آنکھ کھلتی تب انہیں افسوس ہوتا کہ کاش ایسا آج میرے ساتھ حقیقت میں ہوا ہوتا۔

انوکھے شہر کا ہر کام پلان کے مطابق ہو رہا تھا۔ لیکن ایک دن جب ایک روبوٹ کا میکانیکی عمل خاموش ہو گیا تب اس دن اس شہر کی زندگی میں یکایک خلفشار پیدا ہو گیا تھا جب تک روبوٹ بن انہیں تب تک اس گھر کے ہر فرد کی زندگی اجیرن ہو گئی۔ پھر جب کبھی کوئی کمپیوٹر کام کرنا چھوڑ دیتا تو اس گھر کے سارے لوگوں کی یادداشت ہی کھو جاتی کہ وہاں کے لوگوں کی یادداشت تو فلاپی میں محفوظ تھی۔ کون سا کام کرنا ہے؟ کس کو کرنا ہے؟ کیسے کرنا ہے؟ کہاں کرنا ہے؟ کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔ صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک لوگ ایک دوسرے سے پوچھتے رہتے۔ لیکن کوی کو کوئی کام یاد نہیں آتا کہ اب تو ان کے سارے کام کمپیوٹر کیا کرتا تھا جب تک بنتا نہیں تب تک لوگوں پر پاگل پن سوار رہتا۔

ایسی ہی کئی ایک پریشانیوں کو سب مل کر جھیل رہے تھے جسے وقتی طور پر سائنسی دور نے پُر کر دیا تھا۔

لیکن ایک دن ایسا بھی آیا کہ کئی کئی مشینیں ایک ساتھ خراب ہونے لگیں ۔ پریشانیاں دن بدن بڑھتی رہیں ......ایک عورت جب کئی ایک پریشانیوں کو جھیل نہیں پائی تب اس نے ایک اپنے بے حد چاہنے والے شوہر کو اپنی کھردری ہتھیلی دکھا کر روہانسی آواز میں کچھ کہا تھا۔مرد سے بھی رہا نہیں گیا۔ درے ہی دن وہ شہر سے باہر چلا گیا۔ جب لوٹا تو اس کے ساتھ ایک نوجوان تھا۔اُسے سکھا کر لایا گیا تھا۔لا کر پھر سکھایا گیا۔''کوئی پوچھے تو یہ کہنا کہ میں تمہارا انکل ہوں۔ پڑھنے کے لئے یہاں آیا ہوں۔''

اس کے پڑھنے کا انتظام یوں کیا گیا کہ قریب کے اسکول میں دکھاوے کے لئے صرف داخلہ کرا دیا گیا۔ جب کام نہیں رہتا تو اسکول بھیج دیا جاتا۔کام کے دنوں میں وہ گھر پر ہی رہتا۔

ایک دن پڑوس کی ایک عوعرت جس کی اس گھر کی عورت سے بے حد پٹتی تھی وہ اپنے گھر کے کاموں سے بہت پریشان تھی۔ پریشانی کا رونا روتے ہوئے ایک دن پوچھ بیٹھی ۔

''تم سے گھر کا اتنا سارا کام اکیلے کیسے ہو جاتا ہے۔''

پوچھنے والی عورت کے کان پر اس عورت نے اپنے مسکراتے ہوئے ہونٹ رکھ دئے۔

''اچھّا تو یہ بات ہے؟''

دوسرے ہی دن اس کے یہاں بھی ایک جوان لڑکی سجی سنوری ہوئی نظر آئی۔آس پاس والوں کے پوچھنے پر یہ بتایا گیا کہ''نہ میری بہن کی لڑکی ہے اور پڑھنے کے لئے آئی ہے۔''

اس طرح ایک عورت سے دوسری عورت ۔ دوسری عوعرت سے تیسری۔ تیسری سے چوتھی۔ پانچویں.....اور نہ جانے کتنی عورتوں تک یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہا۔

پھر گھر گھر میں کوئی نہ کوئی نیا چہرہ، نا آشنا چہرہ نظر آنے لگا۔ پہلے پہلے لوگ کسی نئے چہرے کو دیکھتے ہی چونک اُٹھتے تھے۔ ''یہ کون ہے؟ کیا کرنے آیا ہے؟'' جواب دینے والا بھی اس نئے چہرے کے ساتھ کوئی رشتہ جوڑ کر گھبراہٹ میں تیزی سے آگے بڑھ جاتا تھا۔

امیرِ شہر کے قہر سے سب ڈرتے تھے۔ اس لئے اپنے اپنے نوکروں کو چھپا کر رکھنے لگے۔ کام کے وقت گھر کا دروازہ باہر سے بند کر دیا جاتا یا پھر کمرے میں اُسے ہی بند کر کے کوئی کام دے دیا جاتا۔ جس لباس میں وہ کام کیا کرتا تھا، اس لباس کو کام کے ختم ہوتے ہی چھُپا دیا جاتا یا پھر دھو کر بند کمرے میں پنکھے کے نیچے سوکھنے کے لئے ڈال دیا جاتا۔ اور اگر کام کرتے وقت کسی کے آنے کی کوئی آہٹ ہوتی یا آتا ہوا کوئی دکھائی پڑ جاتا تو یا وہ خود غسل خانے کی طرف دوڑ جاتا یا پھر کوئی اسے ہی کھینچتا ہوا غسل خانے کے دروازے تک لے جاتا اور اندر ڈھکیل کر باہر سے دروازہ بند کر دیتا۔

دنیا کا یہ واحد شہر تھا جہاں نوکروں کی عید ہو گئی تھی۔ یہاں کے مالک ہی ڈرے ڈرے سے اور سہمے سہمے سے رہتے تھے کہ اگر کسی بات پر نوکر خفا ہو جائے تو بات امیرِ شہر تک پہنچ جائے گی۔ اس لئے جب کبھی کام کرتے وقت ان کے نوکروں سے جیسی بھی بھول چوک ہو جاتی، گھر والے ڈانٹنے، گالیاں دینے اور مارنے کے بجائے تسلّی دیا کرتے۔

''ارے اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔ کانچ کا برتن ہے۔ گرے گا تو ٹوٹے گا ہی۔''

''بھئی کپڑے تو دھوبیوں سے بھی جلا کرتے ہیں۔ اگر دس میں ایک جل ہی گیا تو فرق کیا پڑتا ہے۔ پھر نیا آجائے گا۔''

''پہلے پہل جب لوگ کسی کے یہاں نیا چہرہ دیکھتے تھے تو یوں ہی پوچھ لیا کرتے تھے۔ ''یہ کون ہے؟ کیا کرنے آیا ہے؟'' لیکن آہستہ آہستہ جب ہر گھر میں نئے چہرے نظر آنے لگے تو کون ہے اور کیا کرنے آیا ہے؟ پوچھنے کا یہ سلسلہ خود بخود ختم ہونے لگا کہ اب لوگ نئے چہرے کا چہرہ دیکھ کر رشتے کی بات مسکرا مسکرا کر خود ہی بتانے لگے تھے۔

''لگتا ہے یہ آپ کے بھائی یا سالے کا.......''

ہاں آپ نے ٹھیک سمجھا!'' جواب دینے والا بھی مسکرا کر آہستے سے آگے بڑھ جایا کرتا۔

پھر ایک وقت ایسا آ ہی گیا جب بے شمار ئے چہرے شہر میں نظر آنے لگے۔ لیکن کوئی اب ان چہروں کو دیکھ کر کچھ کہتا نہیں تھا۔ بس ایک نظر دیکھنے کے بعد مسکرانا اور آگے بڑھ جانا لوگوں کا جیسے ایک میکانیکی عمل ہو گیا تھا۔ اس طرح کچھ کو حالات نے نڈر بنا دیا تھا۔ وہ کش اس شان سے اپنے نوکروں کو نہلا دھلا کر اور خوبصورت کپڑے پہنا کر اپنے بچّوں کے ساتھ کھیلنے کودنے کے لئے باہر چھوڑ دیتے تھے تاکہ شک نہ ہو اور اگر شک ہو بھی گیا تو کون......؟

عمر اور حالات کے ساتھ انسان کے خیالات کا بدلنا یقینی ہے۔ امیرِ شہر میں بھی پہلے والی وہ بات نہیں رہ گئی تھی۔ اب کسی چوراہے پر آ کر غریبوں کے خلاف وہ کوئی لمبا چوڑہ بھاشن نہیں دیتے تھے کہ اب اُن کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔
'رِچ گارڈن' کے لئے امیرِ شہر نے اپنی پوری زندگی وقف کر رکھی تھی۔ لیکن بڑھتی عمر کے ساتھ ان کا تندرست اور توانا جسم جھولنے لگا تھا۔ اب ان میں وہ پھرتی اور تیزی نہیں رہی تھی۔ لیکن آج بھی ان کی آواز میں وہ جادو تھا کہ خود بخود لوگ ان کے ارد گرد سمٹنے لگتے تھے۔

بھاشن جاری تھا۔
بھائیو! اس شہر کے قیام کا مقصد کبھی ایک انوکھا شہر بنانا رہا تھا۔ جہاں صرف امیر ہی امیر ہوں۔ ایک بھی غریب.......''
اچانک امیرِ شہر پر کھانسی کا دورہ پڑا۔ دم پھولنے لگا۔ مائک پکڑ کر پہلے وہ کچھ دیر تک کھانستے رہے آخر کار کھانستے کھانستے مائک اسٹینڈ پکڑ کر جھول گئے۔ اس وقت انہیں کوئی پانی پلا رہا تھا تو کوئی پنکھا جھل رہا تھا تو کوئی کچھ۔ لیکن کھانسی تھی کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ اس دوران امیرِ شہر نے اشارے سے اپنے سکریٹری کو بلا اور کھانستے کھانستے کہا۔
''میرے......بیٹے.......کو........جلدی........بلاؤ''

امیرِ شہر کی اس بات پر سب ہکّا بکّا رہ گئے۔ اس لئے کہ امیرِ شہر کے ابرے میں کل تک سب یہی جانتے تھے کہ وہ 'لا ولد' ہیں۔ پھر اچانک 'بیٹا' کہاں سے ٹپک گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد ایک نوجوان مجمع کو چیرتے ہوئے تیزی سے اسٹیج کی طرف بڑھا۔ اسٹیج پر چڑھتے ہی لوگوں نے نوجوان کے چہرے کو ملایا تو وہ چہرہ خود بخود امیرِ شہر کے سالے سے جا ملا۔ تبھی مجمع سے ایک شخص اپنی سیٹ سے مسکراتے ہوئے اُٹھا اور بلند آواز میں کہا۔

''لگتا ہے یہ امیرِ شہر کے سالے کا لڑکا ہے؟''

اسٹیج کے بیچوں بیچ لوگ امیرِ شہر کو گھیرے ہوئے تھے۔ یہ سُنتے ہی امیرِ شہر نے لڑکھڑاتے ہوئے اُٹھنے کی کوشش کی۔ گرتے گرتے سنبھلے۔ پہلے مسکرائے۔ پھر مسکراتے ہوئے کھانستے کھانستے مائک پکڑ کر جھول گئے۔

''تم سب.......ٹھیک ہی.......کہتے ہو.......یہ میرے........سالے کا ہی۔''

یہ کہانی کا دراصل ایک رخ تھا۔

دوسرا رُخ کچھ اس طرح ہے کہ 'غریب نگر' کے ان لوگوں کو جب 'رِچ گارڈن' والوں نے بے سہارا اور بے گھر کر دیا تھا، تب وہ لوگ شہر سے قریب سو کیلومیٹر کے فاصلے پر جا کر بس گئے تھے۔

غریبی کی کوکھ سے ہی امیری کا جنم ہوتا ہے۔ یہاں بھی کچھ ایسے لوگ جن کا روزگار چل نکلا تھا اور تھوڑا بہت پیسہ ہو گیا تھا۔ ان کی شان و شوکت کا کیا کہنا۔ وہ سب بھی اپنے آپ کو دنیا کے کسی رئیس سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ 'رِچ گارڈن' کی بڑھتی ہوئی شہرت کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کے ذہن میں یہ بات سماتی چلی گئی کہ کل جب ان کے ہاتھوں میں وقت آئے گا تو وہ بھی ان لوگوں کو دکھا دیں گے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب اس علاقے کے دس فی صد لوگوں کے پاس کچھ پیسے ہو گئے تو ان لوگوں نے بھی اپنی ایک 'ایسوسی ایشن' بنائی اور اس طرح ایسوسی ایشن کے 'بائی لاج' کے تحت شہر کی حکمرانی 'امیرِ شہر' کے کے ہاتھوں میں چلی آئی۔

اور پھر ایک دن امیرِ شہر منچ پر کھڑے تھے۔

بھاشن جاری تھا۔

''بھائیو! وہ وقت آ گیا ہے اور اب ہم یقیناً 'رِچ گارڈن' والوں کو منہ توڑ جواب دے سکتے ہیں کہ آج ہم سب ان لوگوں سے کسی بھی طرح کم نہیں ہیں۔لیکن یہ سب کچھ کہنے سے نہیں، کرنے سے ہوگا۔تو اس کے لئے اگر ہم سب آج ہی سے اس شہر کی تعمیرِ نو میں اپنا تن، منا ور دھن لگا دیں تو یہ شہر کل یقیناً کسی رِچ گارڈن' سے کم نہیں ہوگا۔''

''اس لئے بھائیو! آج کی رات تم سبھوں کو کیا کرنا ہے۔یہ تو تم سب اچھّی طرح جانتے ہی ہو۔پھر بھی بتا دینا بہتر سمجھتا ہوں کہ شہر کے چوراہے پر لگے ہوئے 'غریب نگر' کے بورڈ کو اکھاڑ پھینکا جائے اور اس کی جگہ 'یونیک سِٹی' کا بورڈ نصب کر دیا جائے۔''

☆☆☆

پاؤں سے جوتے کے درمیان کی دوری

آج پھر میرا بیٹا ہمیشہ کی طرح میرے پاؤں چھوکر گھر سے نکلا ہے۔

پاؤں چھونے کا یہ سلسلہ برسوں سے اِسی طرح جاری ہے۔ صبح سویرے سب سے پہلے وہ نہادھوکر تیّار رہوتا ہے۔ شکن آلود کپڑے پہنتے پہنتے وہ اپنی بوڑھی ماں کے ہاتھوں سے گرما گرم چائے لیتا ہے۔ تلوے گھسے ہوئے جوتے کو برش سے رگڑ رگڑ کر صاف کرتا ہے اور بغل میں فائلیں دبائے مری چال چلتا ہوا وہ میرے پاس سے گزر جانا چاہتا ہے۔ لیکن ایک کونے میں ٹوٹی ہوئی چار پائی پر اِس بوڑھے باپ کو کھانستے ہوئے دیکھ کر وہ رُک جاتا ہے۔ نظریں جھُکائے میرے پاس آتا ہے۔ پاؤں چھوتا ہے۔ مری ہوئی آواز میں ہر روز یہی کہتا ہے۔

''میں جا رہا ہوں بابا۔''

اور میں ہر روز مشینی انداز میں کھانستے ہوئے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ دیتا ہوں۔''بھگوان نے چاہا تو تجھے یہ نوکری.......''

اور ہر روز میں صرف اتنا ہی کہہ پاتا ہوں۔ اس وقت میں امید وبیم کے درمیان جھولتا رہتا ہوں کہ نہیں معلوم آج کیا ہونے والا ہے۔ ویسے ہر روز مجھے یہی اُمیّد ہوتی ہے کہ آج میرا بیٹا زندگی کے بینک سے ٹیلینٹ کا چیک کیش کرا کر گھر لوٹے گا۔ لیکن اِدھر کئی دنوں سے میں دیکھ رہا تھا کہ اس کے قدم

تھکنے لگے تھے۔ گھر سے نکلتے وقت اُس کے ڈگمگاتے لڑکھڑاتے قدم رُک رُک کر میرے دل پر ہتھوڑے کی طرح برسنے لگتے تھے۔ ایسے وقت میں میں درد سے تلملا اُٹھتا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ اسے لوٹ جانے کے لئے کہوں۔ لیکن کہہ نہیں پاتا۔ کیسے کہتا میں اُسے؟ اس کی پیدائش کے دن ہی میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اس ننھی سی جان کو اچھّی شکچھا دلوا کر نویگ کا ایسا ناگرک بناؤں گا، جس پر ساری دُنیا فخر کرے گی۔ یہی وہ خواب تھے میرے۔ اپنے حصّے کی ایک ایک روٹی کاٹ کر جب اسے میں ایم۔ ایس۔ سی تک پہنچایا تب مجھے اس سے اتنی اُمید بندھ گئی تھی کہ اب ماہ دو ماہ کے اندر نوکری خود اپوائنٹ منٹ کے چکّے لگا کر اس کے پاس چلی آئے گی۔ لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ اس لیے میں اندر ہی اندر ٹوٹنے بکھرنے لگا تھا۔ ریٹائر منٹ کے سارے پیسے ہاتھ سے نکلتے ہی آنے والا کل ایک نئے سوال کے ساتھ میرے بڑھاپے کے دروازے پر دستک دینے لگا کہ بڑھتی ہوئی مہنگائی کے ساتھ اگر بیٹے کی بے روزگاری کا مسئلہ حل نہیں ہوا تو تم مستقبل کے آئینے میں اپنے کھردرے اور بے رونق چہرے کو پہچان بھی نہیں پاؤ گے۔

ہر نسل اپنے بعد کی نسل کے بارے میں سوچتی ہے کہ اگر اُس کے پاس سائکل ہے تو اس کے بیٹے کے پاس موٹر سائکل ہو جائے اور پوتے کی زندگی کے شب و روز کار کی تیز رفتار چھاؤں میں گزرے اور......اور میں نے بھی اپنی نسل کے بارے میں، اپنے بیٹے کے بارے میں کچھ ایسا ہی خواب دیکھا تھا کہ اسے میں کبھی بھی اپنی طرح بھاری بھرکم لوہے لگے ہوئے جوتے اور گریس موبل میں شرابور پسینہ آلود فیکٹری کے بدبودار کپڑے پہننے نہیں دوں گا۔ وہ پڑھ لکھ کر افسر بنے گا۔ بڑا بابو کہلائے گا جس کی سفید شرٹ بے داغ اور ہمیشہ چاندنی میں نہائی ہوئی ہوگی۔ جس کے جوتے ہلکے پھلکے، آئینے کی مانند چمکتے ہوئے زمانے کی گرد سے بے نیاز ہوں گے۔

میرے بابا کسان تھے۔ ہر روز تپتی ہوئی دوپہر میں اپنے جسم کے گلاس میں بوند بوند پسینہ جمع کرتے، سورج کے ہونٹوں کی پیاس بجھاتے اور دھرتی کے سینے پر کدال سے وار کر کے اپنی حصّے کا اناج حاصل کرتے۔ دوپہر کا کھانا لے کر جب میں کھیت میں پہنچتا تو بابا

میرے سر پر گمچھا ڈال کر مجھے کھینچتے ہوئے بانس اور پھوس سے بنے ہوئے مچان کی طرف لے جاتے۔ اپنے ساتھ مجھے بھی ستّو، آم اور بیل کا شربت پلاتے۔

''پی لے بیٹا! باہر لُو چل رہی ہے۔ پیٹ ٹھنڈا رہے گا تو لو سے بچے گا۔''

بابا کی ان باتوں پر میرے چھوٹے سے ذہن میں بار بار یہ سوال اُبھرتا کہ دو قدم چل کر کھیت تک آنے جانے میں مجھے لُو لگ سکتی ہے تو بابا کو.....؟ مجھ سے رہا نہیں جاتا اور میں پوچھ بیٹھتا۔ ''اس گرمی میں تجھے لُو نہیں لگتی ہے بابا؟''

تب وہ ہولے سے مسکرا دیتے۔

''پیٹ کے اندر بھی آگ ہے اور باہر بھی۔ باہر کی آگ سے بچیں تو اندر کی آگ جلا دے گی اور اندر کی آگ سے بچنا چاہیں تو باہر کی آگ جلائے گی۔ جلنا تو ہر قیمت پر غریبوں کو پڑتا ہے۔ لیکن میں تمہیں اس آگ میں کبھی جلنے نہیں دوں گا۔ کسی بابو کے ہاتھ پیر جوڑ کو فیکٹری میں تجھے کام پر لگواؤں گا۔ وہاں بڑے بڑے ٹین کے شیڈ کی چھاؤں میں سارا کام ہوتا ہے۔ گرمی سے بچنے کے لئے بڑے بڑے پنکھے لگے ہوتے ہیں۔ آٹھ گھنٹہ ڈیوٹی اور مہینہ پورا ہوتے ہی پگار۔ نہ دھوپ میں پسینہ نکلنے کا خدشہ اور نہ ہی جانوروں سے کھیت چرنے کا کوئی ڈر۔''

جب پہلی بار میں نے بابا سے اس طرح کی باتیں سُنیں تو خوشی سے اس طرح جھوم اُٹھا جیسے کالی کالی گھٹاؤں کے درمیان مور۔ پھر میں آسمان کو چھونے کے لئے بے تاب نظر آنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک خواب میری کم عمر آنکھوں میں بھی پلتا رہا۔ ہر ماہ ڈھیر سا پگار ملے گا۔ اُسے بڑے سے بکس میں جمع کروں گا۔ گاؤں کے سارے کھیت خرید لوں گا۔ بابا راتوں رات ایک غریب کسان سے زمیندار بن جائیں گے۔ اپنا پکّے کا گھر ہوگا۔ نوکر چاکر ہوں گے۔ بہت کچھ ہوگا۔

وقت کی دھرتی پر چلتے چلتے میں بھی جوان ہونے لگا۔ رات کو سوتے جاگتے میرے اندر سائرن کی آوازیں گونجنے لگیں۔ جیسے مجھے کوئی آواز دے رہا ہے۔ فیکٹری کی مشینیں چنگھاڑ چنگھاڑ کر مجھے بلا رہی ہیں۔ چمنیوں کے دھوئیں سگنل دے کر مجھے اپنی طرف

کھینچ رہے ہیں۔ اِدھر بابا مجھے جلد سے جلد اپنے دوست کے پاس شہر بھیج دینا چاہتے تھے ۔۔جو کسی فیکڑی میں کام کرتے تھے۔بہت پہلے جب فیکٹری والے ان کے دوست اپنا کھیت دیکھنے کے لئے گاؤں آئے تو بابا مجھے اپنے ساتھ لے کر ان کے پاس گئے تھے۔ مجھے ان کے پاؤں چھونے کے لئے کہا تھا اور بتایا تھا کہ ''یہ میرا بچپن کا دوست ہے۔شہر میں رہتا ہے اور فیکٹری میں کام کرتا ہے۔ بڑا ہو کر تجھے بھی ان کے پاس بھیج دوں گا۔صاحب سے بات چیت کر کے کسی کام میں لگوا دیں گے۔

''ابھی چھوٹا ہے۔''انہوں نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا پھر بابا سے بولے۔

''بڑا ہونے دو۔ پھر میرے پاس بھیج دینا۔فیکٹری میں کسی بھی صاحب سے کہہ کر کوئی کام لگوا دیں گے۔تم چنتا نہ کرو۔''

بابا کے لئے میں ہر روز کھیت میں ستّو، پیاز، مرچ اور اچار لے کر جایا کرتا اور ہر روز اُنہیں کھیتوں سے لڑتے جھگڑتے مٹّی میں لت پت پا کر وہاں رُکنا چاہتا۔لیکن بابا مجھے کھیت میں کبھی رُکنے نہیں دیتے۔ ہر روز میرے ہاتھ سے کدال چھین لیتے اور فیکٹری کے سُہانے خواب دکھا کر گھر بھیج دیتے۔

برسوں بعد بابا کے وہی فیکٹری والے دوست اپنے کھیتوں کی بُوائی کٹائی کے لئے گاؤں آئے۔ واپسی میں بابا نے میرا ہاتھ اُن کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔کندھے پر جھولتے ہوئے گمچھے سے اپنی آنکھوں کے کنارے کو صاف کیا اور بولے۔

''آج اتنی کڑی محنت کے بعد بھی کسانوں کی کوئی عزّت نہیں کرتا۔کھانے کے لئے کبھی کبھی پیسے جُٹا پانا مشکل ہو جاتا ہے۔لیکن فیکٹری والوں کی آج بھی پوجا ہوتی ہے۔ شہر کی بھول بھلیوں میں اپنے اس بابا کو یاد رکھنا۔''

تب سے لے کر میں دو سال پہلے تک فیکٹری میں کام کیا کرتا تھا۔ پیسے بھی خوب کمائے تھے۔لیکن جب زمین خریدنے کے دن آئے تو ایک دن میرے بابا تپتی دوپہر میں کھدائی کا کام کرتے کرتے لُو کی زد میں آ گئے۔کھیت میں ہی چکرا کر گرے اور مٹّی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چپک گئے۔کچھ دنوں کے بعد میں اپنے ساتھ ماں کو شہر لے آیا۔ یہاں

بھی ان کی طبیعت بحال نہیں ہوئی۔ بابا کے غم میں بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔اس بیماری میں بھی انہیں صرف ایک ہی دُھن تھی۔ میرے سہرے کی۔ بابا کی موت کے سال لگتے ہی ماں نے گاؤں کی ایک بھولی بھالی لڑکی کو میری زندگی کی کھونٹ سے ہمیشہ کے لئے باندھ دیا۔ سال بھر کے اندر ہی پوتے کو کھلانے پلانے اور نہلانے دُھلانے سے لے کر پیشاب پاخانہ صاف کرنے کا سارا سُکھ ماں کو نصیب ہوا۔ وہ بابا کے غم کو آہستہ آہستہ بھولنے لگیں۔لیکن ایک دن اچانک پوتے کو نہلانے کے دوران دل کا دورہ پڑا اور وہ اپنی ہونے والی پوتی کو بغیر کھلائے پلائے ہی ہم سے ناراض ہو کر بابا کے پاس چلی گئیں۔

اب اس بڑھاپے میں میری بیوی بھی زندگی کی آخری ڈور میری طرف سے کھینچ لینا چاہتی ہے۔اس کی بیماری ایسی ہے کہ ٹھیک ہی نہیں ہوتی۔کافی علاج کروایا۔ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ پِت میں پتّھر ہے۔اِس عمر میں آپریشن خطرے سے خالی نہیں۔آپریشن کے نام سے ہی وہ ''نا۔نا'' کہنا شروع کر دیتی ہے۔بہت ڈرتی ہے۔کہتی ہے کہ مر جاؤں گی۔آج سوچتا ہوں کہ اگر ڈاکٹر کے کہنے پر آپریشن کے لئے تیّار ہو جاتی تو پیسے کہاں سے آتے؟ گھر کا چولہا بھی وقت کے آنسوؤں سے بہت پہلے بجھ گیا ہوتا۔ بیٹی بھی ہاتھ پاؤں نکالے باہر جانے کے لئے تیار بیٹھی تھی۔لیکن میری مفلسی کی سڑک سے ہو کر گزرنے والی کوئی بھی گاڑی میرے ہاتھ دینے کے بعد بھی نہیں رُکتی۔شاید رفتہ رفتہ گاڑی والوں کو یہ علم ہو گیا تھا کہ ایک ریٹائرڈ باپ اُس کی مرضی کے مطابق گاڑی کا کرایہ بھلا کہاں دے پائے گا۔

اِدھر کچھ دنوں سے میری بیٹی کافی اُداس رہنے لگی تھی۔میرا بیٹا اس کے مُرجھائے ہوئے گلاب چہرے کی شگفتگی لوٹانے کے لئے صبح سے شام تک اور کبھی رات ڈھلے خاموش قدموں کے ساتھ گھر لوٹا کرتا تھا۔روزانہ گھر سے باہر نکلتے وقت میری بیٹی بڑے ارمانوں سے لنچ بھرا پیکٹ اس کے ہاتھوں میں دیتی۔ برآمدے کے پائے سے ٹیک لگائے اُسے جاتے ہوئے دیر تک دیکھتی۔پرارتھنا کرتی۔شام ڈھلے وہ پھر اُسی پائے کے پاس آ کر کھڑی ہو جاتی۔چہچہاتے ہوئے خوشیوں بھرے چہرے کے لوٹنے کا انتظار کرتی۔لیکن دور سے جب اپنے بھائی کی چال میں ڈگمگاہٹ کے ساتھ نا اُمیدی کی جھلک دیکھائی پڑنے لگتی تو وہ

اپنے دوپٹّے سے چہرے کو پوچھتے ہوئے اندر کمرے میں چلی جاتی ۔ جب اُسے لگتا کہ دوسرے کمرے تک اُس کی سسکی پہنچ جائے گی، تب وہ چُپ ہو جاتی اور لوٹے میں پانی بھر کر آنگن میں چلی جاتی ۔ منہ دھوتی اور کچن کی طرف بڑھ جاتی ۔ یہ سب کچھ دیکھتے دیکھتے میرے ساتھ پتنی کی آنکھیں بھی سوج چکی تھیں ۔ اس کی سوجی ہوئی آنکھیں ایسے وقت میں جب بھی میری طرف اُٹھتیں تو ایسا لگتا جیسے کہہ رہی ہوں ۔ ''تم نے میرے بیٹے کو گمراہ کیا ہے ۔ تم گناہ گار ہو ۔''

میں واقعی اب اپنے آپ کو اپنے بیٹے کا گناہ گار سمجھنے لگا تھا ۔ آج میں اس کے لوٹنے کا انتظار کر رہا تھا ۔ خود کو سمجھنا اور اُسے سمجھانا چاہتا تھا کہ رات یہی کوئی نو بجے کے آس پاس ایک بار پھر وہ نا اُمید گھر لوٹا ۔ چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں ۔ جسم کا ایک ایک انگ ٹوٹا ہوا تھا ۔ چال میں لڑکھڑاہٹ تھی ۔ آنکھوں کے سامنے جیسے گھنا اندھیرا چھایا ہوا تھا ۔ بال بکھرے اور دھول میں اَٹے ہوئے تھے ۔ وہ ہر روز چُپ چاپ کمرے میں داخل ہوتا تھا ۔ کسی سے کچھ نہیں کہتا تھا ۔ لیکن چارپائی شاید دروازے کے پاس ہونے کی وجہ سے وہ میری طرف ایک نظر دیکھتا ضرور تھا ۔ آج بھی اُس کی نظریں میری طرف اُٹھی ہوئی تھیں ۔ لیکن اُس وقت بیٹے سے نظریں ملانے کی تاب مجھ میں کہاں تھی؟ اُس کا ٹوٹا بکھرتا وجود میری جھکی ہوئی پلکوں سے اکثر سوال کرتا ۔ ''باپوا گر تو نے وقت پر میرا رجسٹریشن کمپنی میں کروایا ہوتا تو میں دربدر بھٹکنے کے بجائے آج تیری جگہ کام کر رہا ہوتا ۔'' لیکن مجھے تو کمپنی اور کمپنی کی بڑی بڑی آگ اُگلتی ہوئی بھٹّیوں اور دھواں پھینکتی ہوئی چمنیوں سے چڑھ تھی ۔ میں نے کمپنی کے آئینے میں نئی اور پرانی تصویروں کو اُلٹ پلٹ کر بہت قریب سے دیکھا تھا ۔ صحت مند چہروں پر وقت کی گرد جمتے ہی آنکھیں دھنس جاتی تھیں ۔ گال پچک جاتے تھے اور بھٹّیاں ساٹھ سالہ زندگی کا سارا رس نچوڑ کر انسانوں کی ہڈّی پسلی پر ریجیکٹ کا مہر لگا کر بے کار شئے کی طرح مشینوں کے ذریعہ باہر پھینک دیتی تھیں ۔

میں بھی خوش تھا لیکن یہ کیا ہوا: چمنیوں اور بھٹیوں سے بچانے کے بعد بھی دو سالہ نوکری کی تلاش نے دفتر دفتر میرے خونِ جگر کو اتنا تڑپایا تھا کہ آج اس کی حالت بھٹّیوں اور

چمنیوں کے آس پاس زندگی گزارنے والے لوگوں سے بھی بدتر ہو گئی تھی ۔ جوانی میں بڑھاپے کا رول نبھاتے دیکھ کر مجھے اپنے بیٹے پر ترس آ جاتا۔لیکن اس کا ذمہ دار میں خود کو سمجھ رہا تھا۔اس لئے ہمیشہ میرا سر اُس کے سامنے جھک جایا کرتا۔

آج بھی میرا سر گناہ کے بوجھ سے جھکا ہوا تھا۔ ماں سے نظریں بچا کر وہ آگے بڑھ گیا۔آنگن میں اُس نے دیکھا کہ بہن چہرہ دھورہی ہے۔وہ فائل شیلف پر رکھتے ہوئے کنویں کے پاس پہنچا۔منہ ہاتھ دھونے کے بعد ہمیشہ کی طرح آنگن میں رکھی چارپائی پر اوندھے منہ لیٹ گیا۔بہن نے بھائی کے لئے پہلے چائے بنائی۔پھر تین چار روٹیاں سینک کر اُٹھ گئی۔

''بھیّا کھانا کھالو۔''

وقت کی ٹھوکر کھائے ہوئے بھائی نے جب اپنی آنکھیں اوپر اُٹھائیں تو چھوٹی بہن کی آنکھوں کی ویرانی میں اُداسی کے ڈھیر سارے پرندوں کو پھڑ پھڑاتے دیکھ کر وہ ٹھٹھک گیا۔نظریں چولہے کی طرف اُٹھ گئیں۔

تمہارا چولہا تو بجھ رہا ہے۔لکڑی یا کوئلہ کیوں نہیں ڈالتی؟''

''ایندھن نہیں ہے۔ باپو کو بولی تھی لیکن......''وہ چہرہ دوسری طرف گھماتے ہوئے سسک پڑی۔

پگلی! چلو تم روٹی بناؤ۔ایندھن کا انتظام میں کرتا ہوں۔''اس نے اُٹھ کر مضبوطی سے اپنی بہن کا ہاتھ تھام لیا۔کچھ دیر وہ یوں ہی آسمان کی طرف خالی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ پھر تیزی سے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

میں اندر کمرے میں چارپائی پر لیٹا لیٹا کھڑکی سے کچن کا سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ میری پتنی بھی میرا ساتھ دینے کے لئے میری چارپائی پر آ کر پائنتانے بیٹھ گئی تھی۔اُس کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے تر تھیں کہ تبھی دوسرے روم سے پُرانے صندوق کے کھلنے کی آواز آئی ۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد کھٹ کھٹ کی تیز آواز ہوئی ۔ وہی جانی پہچانی سی ۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے ۔جسم کپکپانے لگا۔تبھی میں نے دیکھا کہ میرا بیٹا ایک ہاتھ میں ڈگری

کی فائلیں لئے پاؤں میں میرے ہی بوسیدہ آہنی جوتے پہنے کھٹ کھٹ کرتا ہوا کمرے سے نکلا اور کچن کے پاس آ کر ٹھہر گیا۔ بہن نے بھائی کے ارادے کو بھانپتے ہوئے ہاتھ سے فائل چھیننا چاہی۔لیکن بھائی نے بہن کے ہاتھوں کو جھٹکتے ہوئے اپنی ڈگری کی ساری فائلیں چولہے میں ڈال دیں۔ ایندھن ملتے ہی ایک بار پھر چولہے کا منہ روشن ہو گیا۔

''میں مرا نہیں ، زندہ ہوں ۔کھانے پینے سے لے کر ضرورت کی ساری چیزیں تمھیں وقت پر ملیں گی۔'' میرے بیٹے نے بھاری بھرکم آہنی جوتے کی طرف دیکھتے ہوئے آگے کہا۔''اب میری بہنا کے لئے کرایہ کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ ہماری مرضی سے گاڑیاں یہاں رُکا کریں گی۔''

بیٹے کے پاؤں میں اپنے ہی بھاری بھرکم بدبودار آہنی جوتے کو دیکھ کر میری بوڑھی آنکھوں میں غصّہ سماتا ہی چلا گیا۔ پتنی نے ہاتھ پکڑ کر بٹھانے کی کوشش کی ۔لیکن میں نے اس کے ہاتھوں کو اِس طرح جھٹک دیا کہ وہ بلبلا اُٹھی۔

تڑاخ !!!

''حرام خور! کیا میں نے تمھیں اسی دن کے لئے پڑھایا تھا کہ تم پڑھ لکھ کر قلی کباڑی کی نوکری کرو اور اس بھاری بدبودار جوتے کو پہن کر فیکڑی جاؤ........فوراً اُتارو اِس جوتے کو۔نہیں تو.......'' میں غصّے سے کانپ رہا تھا۔

لیکن جب وہ ایک فرماں بردار بیٹے کی طرح میرے حکم کو حرفِ آخر مان کر جوتے میری طرف بڑھانے لگا تب میری بوڑھی آنکھوں کے کیمرے نے بیمار بیوی اور جوان بیٹی کے پژمردہ چہرے کی تصویر یکے بعد دیگرے کھینچ لی۔ میں نے ہڑ بڑا کر جوتے واپس اس کے پاؤں کے پاس رکھ دیئے۔

''میرے اور تیرے جوتے کا نمبر لگتا ہے ایک ہی ہے بیٹے.......''

میرے سینے سے الگ ہوتے ہی اُس نے پہلے اپنے پاؤں کو دیکھا اور پھر میرے پاؤں کو۔

کھٹ کھٹ کی وہی آواز......اور بابا کا صدیوں پُرانا مسکراتا چہرہ ایک بار پھر

میری آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ ☆☆☆

بابِل کا مینار

مجھے اس قبر میں صدیاں بیت چکی ہیں، اور آج پھر میری آنکھوں کے سامنے وہی منظر ہے وہی، جو میں نے صدیوں قبل اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

مینار

بابِل کا مینار

جب پرندوں کے تازہ پنکھ نکل آتے ہیں تو وہ کافی اونچائی پر پرواز کرنے کے خوابوں میں اسیر ہو جاتے ہیں۔ خوابوں کی تعبیر جب اپنے نقطہ عروج پر پہنچتی ہے تو ان کے پنکھ لہولہان ہو جاتے ہیں۔ اور وہ پلک جھپکتے ہی آکاش کی بلندیوں سے گر کر زمین کی گہرائیوں میں دفن ہو جاتے ہیں۔

بالکل وہی منظر.......

ان کے بازوؤں میں قوّتِ پرواز کے حوصلے سرگرم تھے۔ بازوؤں کی مچھلیاں پھڑک رہی تھیں۔ دماغ کے تاریک کمروں میں روشنی کا مینار اپنی تیز شعائیں ڈالنے لگا تو انھوں نے بے چین ہو کر زمین کے ایک وسیع خطے میں اس مینار کی بنیاد ڈالی۔

کام جاری تھا۔

مزدور اینٹ، پتھر، بالو سیمنٹ اور چھڑ لیے کسی آٹو میٹک مشین کی طرح نیچے سے

اُوپر اور اُوپر سے نیچے کے اس عمل میں پوری طرح محوِ رقص تھے۔ لیکن وہیں چند ایک لوگوں کی آنکھیں مینار کی بنیاد پڑتے ہی حیران ہو اُٹھی تھیں۔

فرش سے عرش کا لامتناہی سفر........

واقعی یہ بات تعجب خیز تھی۔ بھلا کوئی کیا نتیجہ اخذ کر سکتا تھا؟ لیکن چند ایک کی آنکھوں سے خوشیاں بوند بوند ٹپک کر دھرتی کے سینے کو سیراب کرنے لگی تھیں۔ اور اس سیرابی نے کچھ دنوں کے بعد دھرتی کے بطن پر جہنمی پھول کھلا دیے تھے۔

ہوا

پانی

خلا

تینوں جگہوں پر جب اُن لوگوں کو کامیابیاں ملنے لگیں تو ان کے گوشت کے لوتھڑوں میں غرور کا نشہ طاری ہوتا چلا گیا۔ اور پھر وہ لوگ راکٹ کے دھوئیں کی طرح اپنی کامیابیوں کو ایک کے بعد ایک پیچھے چھوڑتے ہوئے قدیم اسرار سے پُر نیلگوں دبیز پردوں کو اُٹھانے کے لیے شب و روز کی سڑک پہ رواں دواں ہو گئے۔ ان لوگوں کے اس انوکھے پلان پر ساری دنیا کی آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔ وہ لوگ ساری دنیا کی آنکھوں میں حیرت و استعجاب کا رنگ گھول کر ہر ایک سے پرے اپنا منفرد مقام بنانے کے خواب کا سنہرا منظر نامہ ترتیب دے رہے تھے۔ تاریخ کے اوراق میں سنہری حرفوں سے ایک ایسے باب کی تخلیق کرنا چاہتے تھے، جس پر نظریں پھسلتے ہی ہر دور کی آنکھیں لہولُہان ہو جائیں۔

مینار کی تعمیر کا کام شباب کے زینے طے کر رہا تھا۔

وقت کے مختصر سے حصےّ میں ان لوگوں نے اپنی محنت و لگن اور اپنے دماغی کیڑوں کی مدد سے مینار کی کئی منزلیں تیاّر کر لیں۔

لوگوں کے مُنہ سے مسرّتوں کے لاوے اُبل رہے تھے۔

اور آنکھیں........

چمکتی ہوئیں!

پھسلتی ہوئیں!!
پھیلی ہوئیں!!!
ٹھہری ہوئیں!!!!
طلوع اور غروب ہو رہی تھیں؟ ۔لیکن اُن کا تاریخ کے اوراق میں کوئی ذکر نہ تھا۔
مینار شباب کے زینے عبور کر رہا تھا، اور سوکھے شجر ثمر آور ہو گئے تھے۔ان پھلوں میں مٹھاس کی جگہ غرور وتکبّر کی کھٹاس شامل تھی۔
''انسان کے لیے اب کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔''
ایک نے مینار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
''ہم لوگوں کی شب و روز کی محنت......!ممکن ہے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مینار کے ہاتھ پاؤں لمبے ہوتے چلے جائیں اور ایک دن اچانک نیلگوں سمندر میں کوئی بھیانک طوفان آ جائے۔پھر جیت کس کی ہوگی۔یہ تو وقت ہی بتائے گا۔وہ خواب جو برسوں ہماری آنکھوں نے بُنا ہے حقیقت کا روپ لے کر ہماری آنکھوں کے سامنے کروٹیں بدلے گا یا نہیں،نہیں جانتا۔''
''بدلے گا۔ضرور بدلے گا۔اور ایک دن ہماری محنت یقیناً رنگ لائے گی۔''
دوسرے نے ان کی لڑکھڑاتی ڈگمگاتی سوچ کو اپنے لفظوں سے بیساکھی کا سہارا دیا۔
بونے وقت کے دھارے میں مینار اپنا قد اُبھارتا رہا۔اور واقعی قد آور لگنے لگا۔
مینار کے چاروں طرف لوگوں کا ایک جمِ غفیر تھا۔
''اچھا تو تم یہ بتاؤ!اس مینار کے بننے میں کتنے دن لگیں گے؟''
''اتنے کم عرصے میں مینار کی اتنی منزلیں تیّار ہو گئی ہیں۔اور ایک منزل کی اونچائی اتنی ہے۔اور فرش سے عرش کی دُوری اتنی ہے۔اتنے دن تو لگ ہی جائیں گے۔''
''ارے واہ!تب تو اتنے دن کے اندر ہم لوگ عرش کی سیر بھی کر آئیں گے۔''
''بڑا مزہ آئے گا۔''
ہاں کیوں نہیں!مزہ تو آئے گا ہی کہ جنّت اور جہنّم ہمارے دو ہاتھوں میں دھرے

ہوں گے۔''

پھر قہقہوں کی موسلا دھار بارش........

اور فضا میں سرور کا نشہ چھاتا چلا گیا۔

مینار اب شباب کے زینے عبور کر چکا تھا۔ چاروں طرف لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔

''اے مرشد! بتاؤ کہ کیا واقعی اس نیلی چھتری کے اوپر کوئی رہتا ہے؟'' مرید نے مرشد سے دریافت کیا۔

''لگتا ہے دن رات گندے خواب دیکھنے کی وجہ سے تمھارے ذہن میں کوئی ایسا زلزلہ آ گیا ہے، جس سے تمھارے دماغ کی اینٹیں اپنی جگہ سے پرے کھسک گئی ہیں۔ جا کر غسل کر اور پاک وصاف ہو جا کہ یہ سب ناپاکی کے اثرات ہیں۔''

لوگوں کی بھیڑ کے ساتھ مینار کی سیڑھیوں پہ یہ دونوں بھی چڑھتے رہے۔

اس مینار سے متعلق اور بھی بہت ساری باتیں گروہوں میں بٹے لوگوں کے بیچ اور گھروں میں اپنی بیویوں کی قربت کی کشش میں اسیر لوگوں کے درمیان ہوتی تھیں، اُبھرتی تھیں اور دھواں آلود فضا میں تحلیل ہو جاتی تھیں۔

''یہ ساری باتیں فضول اور بے بنیاد ہیں۔'' مرشد چلایا۔

''لیکن میں نے لوگوں سے سنا ہے کہ نیلی وسعتوں کے پیچھے کوئی چھپا بیٹھا ہے۔ اسی نے اس دنیا کی تخلیق کی ہے۔ اور ہم انسانوں کو مٹّی سے پیدا کیا ہے۔''

''میں نے بھی اتنا ہی سنا ہے۔ کیا اس کا حقیقت سے کوئی واسطہ ہے؟'' ایک اور مرید سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

''میں اس بات کو نہیں مانتا کہ کسی نے ہمیں بنایا ہے۔ میں پوچھتا ہوں اگر کسی مصوّر نے مٹّی کے کھلونوں میں جان ڈال کر میرے وجود کی تخلیق کی ہے، تو وہ کہاں ہے؟ کبھی تو میری آنکھیں اُسے دیکھتیں۔ پھر اُس نے اچانک رُک کر پہلے والے سے سوال کیا۔

''کیا تمہاری آنکھوں نے اس مصوّر کو دیکھا ہے؟''

''نہیں!''

ایسے کئی ایک سوال و جواب کا سلسلہ دوسری طرف بھی جاری تھا۔
''تو پھر میں کیسے یقین کرلوں کہ اُس نے ہمیں پیدا کیا ہے۔''الف نے ب سے کہا۔
''مت کرو.......تمہیں کون کہتا ہے کرنے کو۔لیکن تم نے اپنے باپ کو بھی نہیں دیکھا ہوگا۔؟''
''نہیں دیکھا ہے۔کیونکہ میری پیدائش سے قبل وہ تیری ماں کے ساتھ بھاگ گیا تھا۔''
''ہاہا،ہی ہی.......''
''ہی ہی،ہاہا.......''
''اس مینار کو دیکھ رہے ہو نا؟''ایک ٹھگنے نے مینار کی چکنی دیوار پر ہاتھ پھیرتے ہوئے؟ کہا۔"یہ ہم لوگوں کی شب و روز کی محنت و لگن کا ثمر ہے۔اگر مینار کی آنکھیں کھُلی ہوتیں تو وہ ہم لوگوں کو ضرور دیکھتیں۔''
''یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ ہماری ان دو آنکھوں میں اتنی روشنی نہ ہو کہ ہم انہیں دیکھ سکیں؟''ایک کُتےّ جیسی صورت والے نے بھونکتے ہوئے کہا۔
''کیسی باتیں کر رہے ہو یار؟''ٹھگنے نے بُرا سا منہ بنایا اور اپنے سامنے پھیلی ہوئی تمام چیزوں پر نگاہ دوڑاتے ہوئے اپنی آنکھوں کے صحیح ہونے کا خود کو یقین دلایا،پھر کچھ بڑ بڑاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔
''اچھا!اب تم ہی بتاؤ کہ اس نے ہمیں کس طرح پیدا کیا؟''فلسفی نے سوال اُچھالا۔
''معلوم نہیں........''عقل کے کورے نے ہولے سے کہا۔
''تو پھر تمہیں کیا معلوم ہے ؟ کان صاف کر کے سن لو کہ مجھے کسی نے پیدا نہیں کیا ہے۔اور ہاں ایک انسان کا وجود انسان کے لہو سے جدا نہیں۔یہ ہو نہ ہو تو پھر وہ جرثومہ پیدا نہیں ہوگا جس نے بندر کو انسان بتایا۔''
''مجھے لگتا ہے کہ تمھارے اندر ڈارون کی روح سما گئی ہے۔''
مینار زینہ بہ زینہ اُوپر اُٹھتا رہا........کام اپنے آخری مرحلے میں تھا۔
فرش اور عرش کے بیچ سے دوریوں کا لامتناہی سلسلہ معدوم ہو رہا تھا۔ان کے

جسموں سے محرومی اور انا کے دھوئیں نکل کر فضا کو تاریک بنا رہے تھے۔ پنکھ پھڑ پھڑانے کی آوازیں ہواؤں میں تحلیل ہو کر ہر جہت بکھر رہی تھیں۔

''اب کوئی بیرونی قوّت، انسانی وجود کو عرش کی سیر کرآنے سے نہیں روک سکتی۔ اگر کسی نے اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا تو ہماری قوّت اس طاقت کو ہمیشہ کے لیے کسی گہرے سمندر میں دفن کر دے گی۔''

''ہاں یہ ایک چیلنج ہے۔''

''چیلنج۔''

''ہماری طاقت کا لوہا ساری دنیا نے مانا ہے۔ انتظار کا سورج بھی غروب ہو رہا ہے۔ اس گمنام وجود پر سے اب تاریکی کی دبیز چادر سرکنے ہی والی ہے۔ کیونکہ اب لوگ عرش کے بالکل قریب آ گئے ہیں۔ اگر اس کے وجود کا حقیقت سے کوئی رشتہ ہے۔

''تو وہ کہاں ہے؟''

''کس جگہ ہے؟''

''کس حالت میں ہے؟''

''اُ؟ اُسے ہماری آنکھیں ضرور دیکھ لیں گی۔ پھر ایک ملاقاتوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ......''

''انٹرویو ....!'' صحافی نے ہواؤں میں ہاتھ اُچھالا اور آسمان کی طرف فاتحانہ مسکراہٹ سے دیکھا۔

''عرش پر بھی ہمارا جھنڈا لہرائے گا۔''

''اسٹاروار۔(Starwar)''

''نہیں! وہاں نسل در نسل، صرف خدا کے منکر پیدا ہوں گے۔''

مینار کی اس کامیاب تعمیر پر ہر سمت سے قہقہوں کا طوفان اُمڈ رہا تھا۔ مسرتوں اور فتح مندی کی بوندیں ان کے جسموں سے رِس رہی تھیں۔ غرور و تکبّر کا رنگ ان کے وجود پر غالب تھا۔

اب ان کے قدم فرش سے خلاؤں میں منتقل ہو چکے تھے۔فاصلے سمٹ گئے۔ مگر ابھی بھی عرش اور فرش کے بیچ فاصلے کی ایک ہلکی سی لکیر موجود تھی۔

''ذرا دیکھو تو ہمیں........ہمارے بدن پر کتنے بڑے بڑے پنکھ اُگ آئے ہیں؟ اور اب ہم سب عرش کے کتنے قریب آ گئے ہیں؟''

''ہم لوگوں کی برسوں کی محنت اب پوری طرح سے رنگ لا رہی ہے۔''

''ہا........ہا........ہا.........''

''ہی........ہی.........ہی.........''

''ہو.........ہو..........ہو.........''

نیلی وسعتوں کے اُس پار والے نے جب ان لوگوں کی عجیب و غریب حرکتیں دیکھیں تو ان کے وجود سے ایک کرن پھوٹنے لگی۔

پسِ منظر.........

نایاب مینار.........سمٹتے فاصلے۔طویل راستہ۔کلبلاتے دماغی کیڑے۔عرش کی بے شکن دھرتی پر لہو کے بے شمار دھبّے جگہ جگہ پھیلے ہوئے۔عرش پر لہراتا ہوا فرش کا جھنڈا۔ اصول وقوانین کی موت..........

''کیا اسی دن کے لیے اس نے دنیا میں انسانوں کو اشرف المخلوقات بنا کر بھیجا تھا۔ان کے بازوؤں کو مضبوط کیا تھا۔''

دفعتاً طوفان کے آثار نمایاں ہوئے۔بارش کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری ہو گیا۔مگر ان لوگوں پر اس بارش اور طوفان کا ذرّہ برابر بھی اثر نہیں ہوا۔اور وہ لوگ اپنے اس کام میں پہلے ہی کی طرح ہی مگن رہے۔

اخبار، ٹیلی ویژن، ریڈیو چلّا رہے تھے۔

اسٹاروار((Starwar))

یہ کھُلم کھلّا اعلان جنگ تھا۔

یکا یک ہوائیں پاگل ہو اُٹھیں۔

عمارتیں نیست و نابود ہوتی چلی گئیں۔
اشجار سجدہ ریز ہو گئے۔
مینار طوفان میں جھومتے ہوئے درخت کی مثال پیش کرنے لگا۔
اور اس کی پرت کرچیوں میں تبدیل ہو کر روئی کے گالوں کی شکل میں،فضاؤں میں اُڑنے لگی اور تیرنے لگی اور ہچکولے کھانے لگی۔
زوال کا وقت سر کتا ہوا سر پہ آن کھڑا ہوا۔
سورج چھوٹے چھوٹے آگ کے گولے برسانے لگا۔
زمین و آسمان نے انگنت سمندروں کا منہ کھول دیا۔
انسانیت کی کشتی ہچکولے کھانے لگی۔
پہاڑ، پٹھار اور میدان اپنی شکلیں کھونے لگے۔
چیخ و پکار کی آوازیں ہر سمت سے اُچھالی جانے لگیں۔
اور زمین کی جل تھل سطح پر لاشیں ایک کے اوپر ایک تیرنے لگیں۔
پھر سمندر میں گہرا سکوت۔ گہری خاموشی چھا گئی۔ ایک ایسی خاموشی کہ جو اس وقت بھی تھی جب دھرتی کے اصرار پر تاریک غلاف چڑھا ہوا تھا اور خدا کا وجود تاریک پانیوں پر تیرتا تھا۔

اب مینار فنا ہو چکا ہے۔ اور وہ سب بھی جنھوں نے اپنے تازہ؟ پنکھوں پر بھروسہ کرتے ہوئے آسمان کی نیلی وسعتوں کو کھنگالنے ملنے کا تہیّہ کیا تھا۔لیکن آج بھی میری آنکھیں سلامت ہیں اور یہ قبر بھی! جواب میری جائے پناہ ہے۔ پتہ نہیں میری یہ آنکھیں اب کن منظروں سے گزرنے والی ہیں کہ آسمان میں آج بھی سورج اور چاند چمک رہے ہیں اور ستارے اپنے جھرمٹوں میں اسرار کے بے پناہ امکانات سمیٹے ہوئے مسکرا رہے ہیں اور میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ دھرتی پہ اُسی جگہ جہاں کہ وہ مینار ہوا کرتا تھا، وہیں یہ ایک معصوم بچّہ اپنے انگوٹھے کو منہ میں دیئے آسمان کی نیلی وسعتوں کا جائزہ لے رہا ہے۔لیکن ابھی اس کے پنکھ نہیں نکلے ہیں۔

☆☆☆

تم پھر آؤ گے

رات بھیگ کر سو چکی تھی، لیکن آشا بارودی ڈھیر پر کھڑی اب تک سسک رہی تھی۔

آج وقت کا ظالم ازلی طوفان سرشام اس کے نیند نگر کو اُجاڑ کر اُس کی آنکھوں میں کاجل کی کہانی لکھ گیا۔ وہ ساری رات کروٹ کروٹ درد بن کر بستر کی سلوٹوں سے اُلجھتی رہی کہ پانچ سالہ پریت اُس کی کہانی کا ایک انوکھا باب تھا، جو آج کی رات زندگی اور موت کے درمیان کا سفر اسپتال کی سڑکوں پر طے کر رہا تھا۔

رات تاریکی کی چادر میں لپٹی، سہمی اور خاموش کھڑی تھی۔ ایسی رات میں سڑک پر دو ننھے منھے پاؤں کے چلنے کی آواز سے کبھی اُس کی روح کے تار ٹوٹتے تو کبھی خوشیوں کے ستارے اُس کی آنکھوں کے آسمان میں بکھر جاتے۔

اس آنکھ مچولی سے آشا کی ڈور ٹوٹنے لگی تھی۔ پاس آتی ہوئی آواز پر وہ دروازہ کی طرف جھپٹتی۔ چٹخنی تک ہاتھ لے جاتی۔ ہاتھ نیچے کھینچنے سے پہلے ہی آواز دور ہو جاتی۔ پھر وہ اُداس پاؤں سمیٹے بستر تک لوٹ آتی۔ لیکن اس بار آواز گیٹ کے بالکل قریب آ گئی تھی۔ جس کی دھمک ایک ماں اپنے سینے پر صاف سن

رہی تھی۔ وہ دروازہ کی طرف بلّی کی طرح جھپٹ پڑی۔ چٹخنی تک اب ہاتھ پہنچا بھی نہیں تھا کہ سڑک سے تیز بات کرتی ہوئی ایک کار آئی اور دو ننھے منھے قدموں کی چاپ کو اپنے چکّے میں لپیٹ کر دور دھند میں گم ہوگئی۔

آشا کی دلدوز چیخ کے ساتھ دھڑام کی آواز ہوئی اور دونوں پٹ جھول گئے۔

سامنے کار کھڑی تھی۔ سامنے سرندر ناتھ بھی کھڑا تھا، جس کے چہرے پر انگنت آڑی ترچھی لکیریں تھیں۔ جس نے اُس کے سانولے چہرے کو اور بھی دھندلا دیا تھا۔ دھندلے چہرے کو آشا ایک ٹک دیکھے جا رہی تھی۔ پھر عجیب سی کیفیت سے وہ دو چار ہوتی چلی گئی۔ ہاتھ سخت ہوگئے۔ آنکھیں دھندلا پن گئیں۔ جسم پر ایک عجیب سا لرزہ طاری ہوگیا۔

''کچھ بولتے کیوں نہیں.......چپ کیوں ہو؟'' آشا سرندر ناتھ کا کالر پکڑ کر چیخ اٹھی۔

''نہیں، کچھ نہیں۔''

اس ایک جملہ میں سرندر ناتھ نے جانے کہاں سے دنیا کا اتنا درد سمیٹ دیا تھا کہ آشا کی بھیگی آنکھیں سوکھی لکڑیوں کے ڈھیر پر جا کر ٹک گئیں۔

آشا کے اندر بکھرنے کا عمل جاری رہا.......

پھر فضا میں جانی انجانی سی مہک گھل گئی اور پل دو پل میں آسمان سرخ ہوگیا۔

شام ہوئی اور سب لوٹ گئے۔ لیکن وہ رات بھر پلکوں سے راکھ کریدتی رہی۔ اس ایک چہرے کو تلاش کرتی رہی جو اس کا سرمایہء حیات تھا۔ وہ چہرہ راکھ سے الگ ہو کر بار بار اُسے زیروکس(XEROX) کی کہانی سناتا ....وہ اُسے پکڑنے کی کوشش میں آگے بڑھتی۔ ہاتھ بڑھاتی اور وہ راکھ راکھ ہو کر بکھر جاتا۔

آشا بھی ایک بکھری ہوئی عورت ہے۔ چھ سال قبل اس کے گھر والوں نے اس کی آشا کا خون کر دیا تھا۔ وجہ آت روئی تھی۔ لیکن اس کی فریاد سننے والا کوئی نہیں تھا۔ آخر کار باپ کی انا اور سماج کی عزت کی خاطر اُسے زمانے کے آگے جھکنا پڑا۔

سرندر ناتھ کے ساتھ زندگی کی سڑک پر وہ یوں ہی بے ڈھنگی سی چال چلتی رہی

۔ ہر موڑ پر رُک کر چاروں طرف آنکھ رکھتی ۔ ہر آہٹ پر پیچھے مڑتی ۔ پھر مایوس نظریں نیچی کئے آگے بڑھ جاتی ۔

اس کے اندر ایک خواہش تھی کہ ''وہ اُس سے اکثر ملتا رہے۔''اس خواہش نے اُسے بھگوان کے سامنے پرارتھنا کے لئے بار بار کھڑا کیا تھا۔''اگر پریتم کو 'پریم' دے سکتا ہے تو مجھے بھی 'آس' دے۔

آشا کی تپسیا اور پرارتھنا نے ایک بار پھر زمین کے صفحے پر زیروکس کی کہانی کو دہرا دیا تھا۔ پریت سمیر کا 'کاربن' تھا۔ پریت کو پاکر اب آشا کو ایسا لگنے لگا تھا کہ اُس نے کبھی کچھ کھویا ہی نہیں ہے۔

آشا، پریت سے بے حد محبت کرتی تھی، اتنا کہ دوسرے گود لینے کے لئے ترس جاتے تھے۔ اگر کسی قریبی یا عزیز کی ضد پر دیتی بھی تو پل دو پل کے لئے ،اور وہ بھی وہیں اور نظر کے پاس۔

شادی کے بعد آشا کو اپنے باپ سے نفرت سی ہوگئی تھی۔ جب کبھی ماں سے ملنے کی خواہش ہوتی ،نوکر بھیج کر پاس بلا لیتی۔ باپ تو بیٹی کی شکل کے لئے ترس کر رہ گیا تھا۔لیکن پتہ نہیں پریت نے آتے ہی آشا پر ایسا کون سا جادو کر دیا تھا کہ وہ گھر کی ہو کر رہ گئی تھی۔ باپ تو باپ اب آشا اسے بھی ٹوٹ کر چاہنے لگی تھی ،جس کی شکل سے کراہیت ٹپکتی تھی اور جو بچے کی پیدائش سے قبل اُسے رات کی تاریکی میں بھوت کی طرح دبائے رکھتا تھا۔

نئی نویلی دلہن کی بے رخی، اُکھڑے اور سپاٹ چہرے کو سریندر ناتھ پہلی رات سے ہی دیکھتا آیا تھا، جب بھی اس کی روح مجروح ہوتی، وہ خود کے سامنے سراپا سوال بن جاتا۔

''آشا! چپ کیوں رہتی ہے؟ کون سا دکھ ہے اُسے.......کہیں.......؟''

لیکن شک وشبہات کی دیواریں اس دن مُنہدم ہوگئیں، جب پریت دھوپ کی وادی میں شجر بن کر اُگا اور جھلستے جسموں کے لئے سایہ سایہ بن کر پھیل گیا۔

آشا اب وہ آشا نہیں رہ گئی تھی۔ اُس کا 'آس نگر' آباد ہو چکا تھا. وہ ہر طرف

مسکراتی، ہنستی، ناچتی اور گاتی ہوئی نظر آنے لگی تھی۔ اس اچانک تبدیلی نے اُسے ساری دنیا سے دور کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ اس بھگوان کو بھی جس نے اُسے پریت دیا تھا. وہاں بھی اب وہ صبح وشام پھول چڑھانے نہیں جایا کرتی تھی۔ لیکن ایک بار بھگوان کے چرن چھونے کے لئے گھر سے نکلی تھی۔ راستے میں اُسے سمیر یاد آ گیا تھا۔ اور وہ پریت کو چومنے لگی تھی. چومتے چومتے گھر واپس آ گئی تھی۔ پھر کبھی نہیں گئی، کہ اس نے پریت کے اندر سب کچھ پالیا تھا۔

لیکن ایک دن جب آشا نے ایک نقطہ کو دائرہ میں تبدیل ہوئے دیکھا تو خوف سے کانپ گئی۔ اس لئے کہ وہ اُس کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتی تھی۔ پریت کو پانے کے بعد اُس نے بھگوان کو بھی بھلا دیا تھا۔ لہٰذا وہ بے خوف وخطر ایک شام سریندر ناتھ کے سامنے تھی۔

''مجھے ڈاکٹر کے پاس لے چلو۔''

''کیوں......! کیا ہوا ہے تمہیں.......؟''

''میں دوسرے بچے کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتی۔''

سریندر ناتھ نے پہلے سوچا کہ آشا مذاق کر رہی ہے۔ لیکن جب بات مذاق کی حد سے نکل گئی تب اُس نے اسے سمجھانا چاہا۔ نہیں مانی تو ڈرایا اور دھمکایا۔ گھر سے نکالنے اور آخر میں جان سے مار ڈالنے کو دھمکی دی۔ آشا سخت پتھر کی بنی تھی۔ اس پر طوفانی برسات کا کوئی اثر نہیں ہوا، لیکن جب پریت سے علیحدگی کی بات سنی تو کانپ کر رہ گئی۔ آخر کار پریت کی خاطر نو ماہ کے اس طوفانی سفر کو جھیلنے کے لئے آشا نے بڑی مشکل سے خود کو تیار کیا۔

طوفانی سفر اپنی منزل تک ٹھیک ٹھاک ہی پہنچا۔ لیکن گیت کی زندگی کے اس سفر میں آشا نے اُسے اپنی اولاد کا سکھ نہیں دیا۔ گیت کو جنم دینے کے بعد اُس نے کمزوری کا خوبصورت ڈرامہ رچا۔ دو ماہ تک وہ یوں ہی بستر سے چمٹی رہی۔ ان دنوں دفتر سے الگ رہ کر سریندر ناتھ کو ہی ماں کی ذمہ داریاں نبھانی پڑی تھیں۔ دو ماہ کے بعد بھی جب گیت کے ساتھ آشا نے وہی سلوک روا رکھا تو سریندر ناتھ کی آنکھوں کی نیند پوری طرح سے جاتی رہی۔ آشا خوبصورت تھی۔ خوبصورت بیویاں موڈرن دور میں مردوں کی شان میں چار چاند لگاتی ہیں۔ اس لئے

وہ چھٹکارا چاہ کر بھی کھونے کا دکھ جھیلنا نہیں چاہتا تھا۔ پھر بھی ایک دن گیت کی وجہ سے دفتر نکلنے میں دیر ہو گئی اور باس نے پہنچتے ہی ڈانٹا تو اُس دن پہلی بار سریندر ناتھ نے آشا کو بہت مارا تھا۔ آشا بھی اپنی ضد پر اڑ رہی تھی۔

''گیت میرا نہیں، تمہارا بچّہ ہے۔''

آشا کی ان بے وجہ حرکتوں نے سریندر ناتھ کو پریت سے زیادہ گیت کو چاہنے پر مجبور کیا تھا۔ اس لئے بھی کہ گیت کا چہرہ بالکل اسی کی طرح تھا اور یہی سبب ہے کہ آہستہ آہستہ یہ سب کچھ سریندر ناتھ کی عادت کا حصہ بنتا چلا گیا۔ صبح اٹھنا، غلاظت صاف کرنا، نہلانا، دھُلانا اور کپڑے پہنانا، جھولے میں جھُلا کر دودھ کی بوتل کو جالی میں پھنسا دینا۔ سلانے کے لئے لوریاں گانا اور گاتے گاتے خود سو جانا۔ گیت کے بغیر اب سریندر ناتھ کا دل دفتر میں نہیں لگتا تھا۔ اس لیے اب وہ جلد گھر لوٹ آیا کرتا تھا۔ گیت کی نگرانی کے لئے اُس نے گھر میں ایک بارہ سال کی بچی کو رکھ چھوڑا تھا، تا کہ ان کی غیر موجودگی میں آشا کے قہر سے وہ گیت محفوظ رکھ سکے۔ گیت جب پاؤں پاؤں چلنے لگا اور ڈر جب کچھ کم ہوا تو ایک دن سریندر ناتھ نے اُس بچّی کو گھر بھیج دیا۔ اس لیے کہ آشا اُسے بات، بے بات مار بیٹھتی تھی۔

پریت اور گیت کبھی ساتھ تو نہیں رہے تھے۔ لیکن ساتھ رہنے کے لئے اکثر بے چین رہا کرتے تھے. پریت گیت کو جب ''چھوٹو'' کہہ کر پکارتا تو آشا اُسے گھور کر دیکھتی۔ جب وہ پاس چلا جاتا تو اُسے کھینچ کر لے جاتی اور جب گیت ''بھائی بھائی'' کہتا ہوا پریت کے پاس جانے کی کوشش کرتا یا پھر چلا جاتا تو آشا اس کے کان مروڑ کر وہیں دو چار چپت لگا دیتی۔ گیت روتا ہوا دور جا بیٹھتا۔ دور سے ہی ماں کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا کرتا۔ کبھی پاس جانے کو جی چاہتا تو آگے بڑھ جاتا۔ لیکن آشا کی آنکھوں کی لالی اُسے آگے بڑھنے سے روک دیتی۔ وہ ہر بار خوف سے پیچھے ہٹ جاتا اور ایک کونے میں جا کر خاموشی سے سہم کر بیٹھ جاتا۔

رات بھیگ کر سو چکی تھی، لیکن آشا بارودی ڈھیر پر کھڑی اب تک سسک رہی

تھی۔

پریت اُسے چھوڑ کر جا چکا تھا۔اس کے پاس اب صرف گیت رہ گیا تھا۔ایسے میں گیت کی طرف آشا کی نظر کا گھوم جانا ایک عام بات تھی۔لیکن ایسے وقت میں بھی گیت کی طرف دیکھنا گوارانہیں کیا۔اب اُس کی دنیا سمٹ کر اس کے کمرے میں چلی آئی تھی۔جہاں چارپائی پر گری ہر وقت وہ اُلٹی سیدھی باتیں سوچا کرتی۔کبھی یہ تو کبھی وہ ....اور کبھی فریم میں جڑی ہوئی پریت کی تصویر سے پاگلوں جیسی باتیں کرتی دیکھی جاتی۔ اس طرح اس کی زندگی بے رنگ، بے کار، بے لُطف اور بے سمت ہو چکی تھی۔

''انسان کے بس میں کچھ بھی نہیں ہے۔وہ تو صرف ایک میڈیم ہے۔''

آشا ایسی باتوں سے جھلاّ جاتی،کبھی چیخ کر،کبھی آہستہ،کبھی روتی ہوئی اور کبھی نظروں کو زبان عطا کرتی۔

''تم کیا جانو عورت کا درد،مرد ہونا؟''

آشا گیلی آنکھوں کے ساتھ ہاتھ جوڑ لیتی اور سریندرناتھ بھی تھک ہار کا الگ ہو جایا کرتا۔

انسان حادثوں کا مجموعہ ہے۔حادثات انسان کو جنم دیتے ہیں اور حادثے سے ہی انسان ملتا بچھڑتا ہے۔پریت کو گئے ہوئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔آج کی رات بھی وہ سو نہیں سکی تھی۔صبح آ کر جا چکی تھی۔پلکیں بوجھل اور اندھیرے میں گم تھیں۔وقت یہی نو بجے کا رہا ہوگا۔ آشا بستر پر کروٹ بدل رہی تھی۔گیت دودھ کی بوتل سے کھیل رہا تھا۔وہ چھ بجے سریندرناتھ کے ساتھ اُٹھا تھا۔دفتر گئے ہوئے سریندرناتھ کو دو گھنٹے ہو چکے تھے۔اس دوران آشا نے کئی بار چادر سے سر نکال کر سامنے میز پر رکھی ہوئی پریت کی تصویر کو دیکھا۔

آشا کی آنکھیں بھیگ کر سمندر ہو چکی تھیں........

بھیگی آنکھوں کے ساتھ اس نے دیکھا کہ سورج کھڑکی سے اندر آ گیا ہے۔یہ دیکھ کر وہ حیران ہو اُٹھی۔اور پھر جب گیت کی معصوم نظریں کھیلتے کھیلتے تصویر کے چاروں طرف گھومتی ہوئی روشنی پر پڑیں تو وہ بھی خوشی سے اپنے آپ کو اُس طرف بڑھنے سے نہ

روک سکا۔ آشا نے روکنے کی کرنے کی کوشش کی، لیکن اس کے ہاتھ بڑھانے سے پہلے ہی گیت پریت کی تصویر کے پاس پہنچ گیا۔ اس جیت پر گیت مسکرائے جارہا تھا۔ اُس وقت آشا کی بھیگی آنکھوں میں بھی روشنی بوند بوند پھیل گئی تھی۔ اب وہ ایک ٹک کبھی سورج کو اور کبھی اُس گیت کو جس سے وہ بے حد نفرت کرتی تھی، دیکھنے لگی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا جب گیت کو دیکھنے کے بعد اُس کی آنکھوں کی زرخیز زمین پر نفرت کی فصل نہیں اُگ پائی تھی۔

پھر یہ ہوا کہ گیت، پریت کی مسکراتی ہوئی تصویر دیکھ کر پاگل ہوا اٹھا ''بھائی'' کہتے ہوئے اس نے دودھ کی بوتل کو ایک طرف اُچھال دیا. ہاتھ تصویر کی طرف بڑھایا، اُٹھایا اور چھوٹے چھوٹے مگر تیز پاؤں رکھتا ہوا سڑک تک پہنچ گیا۔

کار کی آواز سُن کر آشا کی جان نکل گئی۔ چیخ سے اُس کی روح کے پرخچے اڑ گئے۔ زوردار بریک کے ساتھ کار گیت کے پاس آ کر رک گئی۔ کچھ ہی فاصلے پر گیت، پریت کی تصویر لئے مسکرا رہا تھا۔

نوجوان نے کار سے اُترتے ہی گیت کو اپنی گود میں اُٹھا لیا۔ آشا تو جیسے آدھی مر ہی چکی تھی۔ ''میرا بچہ....... میرا بچہ'' ہانپتی، کانپتی، چیختی، چلاّتی وہ گیت کے پاس دوڑتی ہوئی چلی آئی۔ گیت کے ہاتھ سے ایک ہی جست میں تصویر چھین کر سینے سے لگاتی ہوئی، پاگلوں کی طرح وہ پلٹی۔ پلٹتے پلٹتے رُکنے کی کوشش کی۔ لڑکھڑائی اور پھر سنبھل گئی۔

''تم......؟'' آشا کی آنکھیں سراپا سوال بن گئیں۔''

'' حادثے کا علم ہوا تو سوچا کہ تم سے مل لوں۔'' اُس وقت آشا کی بوند بوند آنکھوں میں روشنی اس طرح اُتر آئی تھی، جیسے سمندر کی سطح پر چاندنی بچھائی گئی ہو۔

''کیا ہوا تھا اُسے.......؟'' سمیر سنجیدہ تھا۔

ایک شام جب میں اُسے کمرے میں ڈھونڈ چکی تو آنگن میں پہنچی، ایسا لگا کہ وہ چھت پر ہے۔ پھر ہلکی سی جھلک دکھائی دی۔ اُس وقت نہ جانے تم کہاں سے آ گئے تھے۔ میں نے بھی سمیر کہہ کر اُسے پہلی بار پکار بیٹھی تھی اور وہ بھی میری گود میں آنے کے لئے اچانک جذبات کی سرحد پار کر گیا تھا۔ پھر ہونا کیا تھا......؟ بارش کا زمانہ تھا۔ پاؤں......'' وہ

بولتے بولتے رُکی۔ پھر سسکنے لگی

''اس تصویر کو دیکھ رہے ہونا.......؟ کسی کو کھو کر اس طرح پا لینا محبت کی کتنی بڑی جیت ہے یہ مجھے تمہارے علاوہ کون بتائے گا؟'' سمیر کی آنکھیں اپنے بچپن کو اتنے قریب پا کر حیرت سے پھیل گئیں۔ اُس وقت آشا کے چہرے پر تمازت کی چاندنی سے ایک نیا تاج محل جنم لے رہا تھا، جس کے سفید بدن پر محبت کی انوکھی کہانی لکھی تھی۔

پہلے دنیا نے تمہیں مجھ سے صرف اس وجہ چھین لیا کہ تم مسلم تھے۔ لیکن پریت تو میری کوکھ کا حصہ تھا۔ اُسے پا کر میں نے سارے غم بھلا دیئے تھے، آج وہ بھی نہیں رہا۔ ایک تم ہو اور وہ بھی اتنی دور کہ.......؟''

آشا کو آج نے صدیوں کے بعد قربت سے سرفراز کیا تھا، اس لئے وہ سرک کر سمیر کے بالکل قریب آ گئی تھی۔

''تم کہنا کیا چاہتی ہو......؟''

''تم پریت بن کر میرے گھر آ جاؤ، یا سمیر بن کر مجھ سے ملتے رہو۔''

سمیر انجانے خوف سے کانپ اُٹھا، کانپتی آنکھوں سے اُس نے کلائی کو دیکھا اور کانپتے پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔

''میں جا رہا ہوں۔''

آشا نے روکنا چاہا۔ لیکن کچھ سوچ کر بولی۔

''میں تمہیں روک تو نہیں سکتی، لیکن ایک التجا تو کر ہی سکتی ہوں۔''

سمیر نے پلٹے بغیر کہا۔ ''کیا......؟''

''تمہارا یہ چہرہ اب میری زندگی بن چکا ہے۔ میری بے چین نظروں کی تسکین کے لئے تمہیں .... ورنہ میں........؟'' آشا کی آواز گرداب میں اُلجھ کر رہ گئی تھی۔ وہ رونے لگی۔

ایک طرف آشا کی پیاسی محبت تھی تو دوسری طرف ایک گھر کی تباہی کے ساتھ زمانے کا خوف بھی تھا۔ وہ نظریں جھکائے گیت کی طرف بڑھتا رہا۔ آشا کانپ کر رہ گئی۔ اُ

س کی روح میں اُتر جانے والا چہرہ اُس کی نظروں سے ہمیشہ کے لئے دور جا رہا تھا۔ اُس وقت آشا کی آنکھوں میں آنسوؤں کا آتش فشاں پھوٹ پڑا۔

سمیر ایک آخری نظر آشا پر رکھتا ہوا ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ آشا لپک کر کار تک گئی اور گیٹ پکڑ کر اِس طرح جھول گئی جیسے وہ کوئی ننھی منّی سی بچی ہو۔ جسے ضد کرنا اور اپنی بات منوانا خوب آتا ہو۔ وہ آخری دم تک کوشش کرتی رہی۔

''بولو نا سمیر آؤ گے نا......؟''

کار اسٹارٹ ہونے کی آواز میں آشا کی آواز دب کر رہ گئی تھی۔ سمیر نے بغیر کوئی جواب دیئے آشا کو گہری نظروں سے دیکھا اور سر جھکائے آہستہ آہستہ گاڑی کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

زندگی کے اس سفر میں آشا، سمیر کی آنکھوں میں نہیں بلکہ اپنی آنکھوں میں اُسے رکھنا چاہتی تھی۔ اب دیکھ بھی نہیں پائے گی۔ اب صرف اُس کی حسرت بھری نگاہیں تھیں اور دور جاتی ہوئی کار۔ ایک طرف دونوں کے درمیان کی دوری آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی اور دوسری طرف آشا سوچ رہی تھی......''اب یہ دوریاں کیسے سمٹیں گی؟''

''ماں!''

گیت، ماں کو ڈھوڑتا ہوا کمرے سے نکلا اور چھوٹے چھوٹے پاؤں رکھتا ہوا آشا کے پاس پہنچ گیا۔ پریت کی موت کے بعد وہ کئی بار آشا کے قریب جانے کی کوشش کر چکا تھا۔ ہر بار اُسے ڈانٹ ملی تھی۔ جبکہ سمیر اُس سے دور جا رہا تھا۔ اُسی وقت گیت سامنے آ گیا تھا اور آنچل کو کھینچتا ہوا ''ماں، ماں! کہہ رہا تھا۔

آشا، گیت سے نفرت کرتی تھی۔ ایسے وقت میں وہ غصے سے پاگل ہو اُٹھی۔ اُس وقت اس نے پوری طاقت سے گیت کو اپنے کاندھے سے اُوپر اٹھا بھی لیا، لیکن وہ ایسا نہ کر سکی۔ اس لئے کہ اُس وقت اُس کی نظر دور جاتی ہوئی گاڑی پر ٹھہر گئی تھی اور وہ گیت جو آشا کی سُرخ آنکھوں سے گھبرا کر ایک کونے میں چھپ جایا کرتا تھا، آج بغیر خوف کے مسکرائے جا رہا تھا۔ آشا کے اُٹھے ہوئے ہاتھ اس اچانک تبدیلی سے رُک گئے۔ جبکہ گیت کے ہاتھ

اُوپر نیچے ہل رہے تھے۔ وہ گاڑی کی طرف نظریں کئے چھوٹے ہاتھوں سے سمیر کو بلا رہا تھا۔

''آ.......آ.......آ.......''

گیت کی اِس حرکت پر آشا کی آنکھیں پھیل کر آسمان بن گئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس نے جس کے کومل جسم کو قدم قدم پر کچلا تھا۔ اُس کے لئے وہ اتنی بڑی قربانی دے گا اور آج جب پہلی بار آشا نے گیت کو اپنے لئے مسکراتے ہوئے دیکھا تو اُس کی بھی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہ اور زور زور سے اُپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو ہلانے لگا۔

کار دور دُھند میں گم ہو رہی تھی اور گیت اُسے بلا رہا تھا۔ اُس وقت آشا پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ وہ گیت سے بے حد نفرت کرتی تھی۔ اُسے آج بے تحاشہ چومے جا رہی تھی اور جب گیت کے چھوٹے ہاتھوں کو چومتے، چومتے آشا نے اپنے ہونٹوں پر صندل کی خوشبو کو محسوس کیا تو وہ اپنے آپ میں مسکراتے ہوئے بڑبڑانے لگی تھی۔

''تم جا رہے ہو، جاؤ........ مگر، کل لوٹ کر پھر آؤ گے، یہیں اور اسی جگہ، تب تم پریت کے بجائے گیت کے بارے میں پوچھو گے۔''

☆☆☆

شناخت

دنیا کا عظیم چوراہا.......

لوگوں کا ہجوم، میں اور ایک لاش.......لاش کے چاروں طرف پھیلے ہوئے اجنبی چہرے۔ میری پھٹی اور خاموش مگر سوالوں کا جواب ڈھونڈھتی آنکھیں.......زمین سے چمٹی، گونگی آنکھوں سے آسمان کو گھورتی ہوئی لاش اور میری چشم نم.......

میں نے ڈبڈبائی آنکھوں سے ہجوم کا جائزہ لیا۔ لوگوں کی بڑی، چھوٹی، سیاہ، بھوری، سیاہ چشمے اور گولڈن فریم میں سجنے والی ساری کی ساری آنکھیں، زمین و آسمان کے درمیان پھیلے ہوئے مختلف خانوں میں منقسم چہروں کے ذریعہ اس لاش کی شناخت میں مکمل طور پر لگی ہوئی تھیں۔

پھر اوروں کی طرح میں نے بھی اس پیچیدہ مسئلے کو سلجھانے کے چکر میں الجھتا ہی چلا گیا۔ الجھتے الجھتے شناخت کا یہ مسئلہ اس وقت سلجھتا ہوا نظر آیا جب وقت کی تیز و تند ہواؤں نے لاش کے چہرے پر پڑی اجنبیت کی دبیز چادر کو تار تار کر کے فضاؤں میں بکھیر دیا۔

وہ میری لاش تھی.......

میں نے خود کو پہچاننے میں نہ غلطی کی اور نہ ہی تاخیر۔اس لئے میری آنکھوں میں شناخت کے جگنو اچانک جگمگا اٹھے۔

میرے چہرے مہرے اور رنگ وروپ سے کسی نے میری شناخت کی تو کپڑوں پر نظریں پڑتے ہی وہ اپنی آنکھیں موڑ کر فوراً اپنے راستہ ہولیا۔کپڑوں سے جب کسی کی آنکھوں میں شناخت کے گہرے دیپ جلے تو رنگ وروپ کے آوارہ جھونکوں نے اسے بجھا دیا۔بال تو عام سے تھے۔اس طرح میں ہجوم کے درمیان بے شناخت ہو کر رہ گیا۔

''جب کسی شناخت دھند لکے میں گم ہو جاتی ہے تو تاریخ کے صفحات اس کے نام ونشان کو اپنے سینے سے کھرچ کر الگ کر دیتے ہیں۔'' ہجوم میں کسی نے میری ہی آواز میں مجھ سے سرگوشی کی۔

''تو کیا میری شناخت بھی دھند لکے میں گم ہو چکی ہے۔''

''تو کیا میں سچ مچ مر چکا ہوں؟''

''نہیں نہیں...... ابھی تو میں زندہ ہوں۔یہ تو میری لاش ہے۔''

میں روتے روتے اپنی لاش کے قریب پہنچ گیا اور اُس سے لپٹ گیا۔لوگ میری ان حرکتوں کی وجہ سے مجھے پاگل سمجھنے لگے۔

''اس آدمی کا باپ بھائی یا پھر کوئی عزیز کسی حادثے میں ضرور مارا گیا ہوگا۔اس لئے بیچارہ پاگل ہو کر اِس لاش کو اپنی لاش سمجھ بیٹھا ہے۔''

اور میں لوگوں کی باتوں سے بے نیاز اپنی لاش کو اپنے وجود سے چمٹائے تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا بھیڑ سے باہر نکل گیا اور لوگوں کے درمیان سے گزرتا ہوا قبرستان پہنچا۔وہاں سنّاٹے دوڑ رہے تھے۔میرے آگے، میرے پیچھے، دائیں، بائیں، سنّاٹے ہی سناٹے۔مجھے ایسا لگا جیسے یہ پُر اسرار سناٹے مجھے گھیر لینا چاہتے ہوں۔مجھے اپنے آپ سے چھین لینا چاہتے ہوں۔خوف سے میرا وجود دہل گیا۔جب میں نے محسوس کیا کہ سناٹے اب میرے وجود پر وار کرنے والے ہیں تو میں نے اُن کے نوکیلے پنجوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لئے خود کو اپنے اندر سمولیا اور خود پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔

ایک بوڑھے درخت کے سائے تلے بوڑھے گورکن کے ساتھ دواور بوڑھے شخص بیٹھے ہوئے تھے۔ جو میرے لئے اجنبی نہیں تھے۔ میں اپنی لاش کو چار پانچ گز کے فاصلے پر رکھ کر ان لوگوں کی طرف تیزی سے بڑھا۔ پہلے میری آنکھیں دونوں شناسا چہروں پر جا ٹکیں۔لیکن میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس وقت دونوں کے چہرے سے اجنبیت کی بو ٹپک،ٹپک کر پوری فضا میں پھیل چکی تھی۔جس میں شناسائیت کالمس تک باقی نہیں رہا تھا۔

پھر میں گورکن سے مخاطب ہوا.......

''برادر! دنیا کے عظیم چوراہے سے میں نے اپنی لاش اُٹھا لایا ہوں، اسے اس قبرستان کے کسی گوشے میں دفن کردو۔''

لاش کے چہرے پر گورکن کی آنکھیں پھیل گئیں؟ یہ تم ہو.......؟''

''ہاں برادر......!''

''نہیں! یہ تم نہیں ہو سکتے۔ میں یہاں ہزاروں برس سے کئی کروڑ لوگوں کو دفن کر چکا ہوں۔ میری آنکھیں دھوکہ نہیں کھا سکتیں۔دیکھو اس کی شکل وصورت اور سیاہیوں کے بے نیاز چہرہ........کپڑے سے میں نہیں مان سکتا۔''

''نہیں برادر! مجھ پر بھروسہ کرو۔ یہ میں ہی ہوں۔''

''بھروسہ......؟'' گورکن کے ہونٹوں پر طنز کھیلنے لگا تھا۔'' آدم کو بھی اپنے بیٹوں پر بہت بھروسہ تھا برخوردار، لیکن کیا ہوا......؟ اور پھر بھروسے کی ریت تو اُس دن سے ہی اُٹھ چکی ہے جس دن قابیل نے ہابیل کا قتل کیا تھا......اگر اب بھی تمہاری آنکھوں میں اُمید کی کرن جاگ رہی ہیں تو جاؤ اور زمین کے کسی کونے سے دو چار بھروسے مند چہروں کو لے آؤ جو تمہیں پہچانتے ہوں۔'' گورکن یہ کہتا ہوا اُٹھا اور دونوں کے ساتھ قبروں کی پگڈنڈیوں سے ہوتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔

میرے ہونٹ ہلے۔لیکن کچھ کہنے سے پہلے ہی ایک دوسرے سے چپک گئے۔ شاید یہ وقت کا تقاضا تھا یا پھر فطرت کا اصول کہ جب شناسا چہرے اجنبی بن جائیں تو شناسائی دکھانا بے وقوفی کی علامت ہے۔اور میں ان علامتوں کے بوجھ تلے دب کر اور

سسک سسک کر زندگی نہیں جینا چاہتا تھا۔
اس لئے میں آگے بڑھ گیا........
شمشان گھاٹ........
دریا کے کنارے کنارے چلتا ہوا میں دروازے کے اندر داخل ہوا تو کچھ ہی دور جا کر کریا کرم کرنے والے پنڈت جی سلگتی لکڑیوں کے ڈھیر کے آگے منتر پڑھتے ہوئے مل گئے۔
''پنڈت جی!'' میں اس طرح مسکراتے ہوئے ان کی طرف بڑھا جیسے برسوں بعد معشوق سے ملن ہو رہا ہو۔''
''ارے بھئی! یہاں کہاں آ رہے ہو.....؟'' انہوں نے گھورتے ہوئے پوچھا۔
''پنڈت جی! اب آپ ہی بتایئے کہ یہاں کوئی لاش کو لے کر بھلا کیوں آتا ہے؟
''میری مسکراہٹ کچھ پھیکی پڑ گئی تھی۔
'' ہاں، ہاں! وہ تو ٹھیک ہے، لیکن یہ کس کی لاش ہے.......؟''
''میری ہے پنڈت جی۔''
''تمہاری........؟ لیکن اس کے سر کی چوٹی، جنیو اور پیشانی پر تلک کا نشان........ یہ سب کہاں ہیں؟'' پنڈت جی نے لاش کو اُلٹ پلٹ کر اچھی طرح سے دیکھنے کے بعد کہا۔
''سب کچھ ویسا ہی ہے پنڈت جی۔''
''کیسا.......؟''
''جیسا اس زمین پر خدا نے ہمیں اُتارا تھا۔ یہ سب کچھ تو یہاں کی چیزیں ہیں، ہماری آپ کی دی ہوئیں۔'' میں نے جب اُنہیں سمجھانا چاہا تو وہ ناراض ہو گئے۔
''ہاں، ہاں! میں بھی پرلوک کی نہیں، یہیں کی باتیں کر رہا ہوں۔''
''لیکن وہ سب کچھ تو.......؟'' میں نے ہاتھ جوڑتے ہوئے اُن کے پاؤں پکڑ لئے۔
''جاؤ! جب یہ سب کچھ تمہارے پاس ہو جائے تب آنا۔'' پنڈت جی میری

طرف سے منہ پھیر کر آگے بڑھ گئے۔

شمشان گھاٹ سے نکالا گیا میں، اور میری لاش اب گرجا گھر جانے والی سڑک کی طرف بڑھ رہے تھے، کبھی تیز، کبھی آہستہ اور کبھی.........

میں، میری لاش اور شناخت کی وہی مسئلہ.........

"فادر!" سیڑھیوں کی جانب اِشارہ کرتے ہوئے میں نے کہا۔"وہ لاش جو سیڑھیوں کے نیچے رکھی ہوئی ہے۔وہ میری ہے۔میں اپنے ہونے کا سرٹیفکیٹ لینا چاہتا ہوں تا کہ اپنی لاش کو قبر میں اُتارنے سے پہلے اپنے ہی روبرو کہیں یہ نہ کہنا پڑ جائے کہ یہ میں ہی ہوں۔"

جنگل کا جنگل، سمندر کے سمندر ناکامیوں کا سفر کرتا ہوا.........

اور میرے اندر کا میں اسی طرح بدستور چیختا رہا.........

"فادر! میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر میرے اندر جھانکو اور دیکھو کیا میری آنکھوں کی گہرائیوں میں کی یسوع مسیح کی تصویریں نہیں ہیں؟ میرے سینے کو چیر کر اپنی آنکھیں میرے دل پر گاڑ دو اور بتاؤ کہ تُمہارے سینے پر لٹکتے ہوئے صلیب جیسے نشان میرے دل کے اندر ثبت نہیں ہے؟"

میرے اندر کا میں چیختا رہا۔لیکن اُس وقت مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میری چیخ میں کوئی آواز ہی نہیں ہے۔شاید آواز کو وقت کے گھنے جنگل نے نگل لیا تھا۔یا پھر میرے اندر کا میں ہی نہیں چیخ رہا تھا۔کیونکہ میں تو مر چکا تھا۔

پھر میں اپنی لاش کو لے کر جنگل کی طرف بڑھ گیا.........

سڑک سنسان اور دھند لکے میں لپٹی ہوئی تھی۔سڑک پر میرے قدموں کے ساتھ ایک اور چاپ اُبھر رہی تھی۔میرے ساتھ سڑک بھی چل رہی تھی۔اس سمت سے جس سمت میں میرے قدم بڑھ رہے تھے۔اس لئے جنگل اور میرے درمیان کی دوری جوں کی توں رہ گئی۔میں وہیں کا وہیں تھا۔صرف میرے قدم اُٹھ رہے تھے۔سڑک چل رہی تھی۔اور میں سوچ رہا تھا کہ میں چل رہا ہوں۔

شاید جنگل کو میرے بے شناخت ہونے کا علم ہو چکا تھا۔اس لیے وہ مجھ سے دور بھاگ رہا تھا۔

میں اب کافی تھک چکا تھا۔ میرے پاؤں میں چھالے پڑ گئے تھے۔اس لئے اب سوائے واپس لوٹنے کے میرے پاس کوئی اور چارہ نہیں تھا۔

میں اب لوٹ رہا تھا......

اور اب میں سڑک کی مخالف سمت میں چل رہا تھا۔ میں ایک قدم سڑک کی طرف بڑھاتا۔سڑک میری طرف ایک قدم بڑھاتی اور اس طرح ایک بار میں دو قدموں کا فاصلہ طے کر پانے میں سڑک میری معاون بنی۔

راستے بھر سوچ کے سمندر میں سوالوں کے پتھر گرتے، گرداب بنتے، پھیلتے اور بکھر جاتے۔ یہ عمل کافی دیر تک چلتا رہا۔

پھر اچانک فضاؤں میں بہت سوالیہ نشان ابھرے.......

''کیا قابیل نے ہابیل کو پہچاننے کی کوشش کی تھی.......؟''

''کیا راون کو سیتا کی پوترتا کا علم نہیں تھا.......؟''

''کیا یزید محمدؐ کے خاندان سے بے خبر تھا.......؟''

''کیا عیسیٰ مسیح کو صلیب پر ہم نے نہیں لٹکایا تھا.......؟''

''کیا آج ہر موڑ پر ہزاروں راون، یدھشٹر، یزید اور قابیل مکھوٹا لگائے نہیں کھڑے ہیں.......؟''

''کیا قبرستان کے گورکن، شمشان گھاٹ کے پنڈت، گرجا کے پادری اور ان چہروں کو تم نے غور سے نہیں دیکھا جو سماج میں بلند مقام رکھتے ہیں.......؟''

میری لاش نے مجھ سے اس طرح کے کئی سوالات کئے اور جواب میں، میں مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑا رہا۔

پھر آگے بڑھ گیا۔

اچانک میرے قدم ایک طرف اُٹھتے ہی چلے گئے ....راستہ جانا پہچانا تھا۔

راستہ جب جانا پہچانا ہوتو فاصلے خود بہ خود سمٹ جاتے ہیں۔

اور آج میں دنیا کے اسی عظیم چوراہے پر پہنچ گیا ہوں۔ جہاں ہر رات وقت کا قتل ہوتا ہے اور چوراہا لہو سے جل تھل ہو جاتا ہے........اور دن بھر کا سورج ہر روز اپنی چٹوری زبان سے سارے لہو کو چاٹ کر اپنی بھوک مٹاتا ہے۔

دنیا کا یہ عظیم چوراہا اب اندھیرے میں پوری طرح ڈوب چکا ہے۔ میں نے اندھیرے میں اپنی اندھی آنکھیں اِدھر اُدھر دوڑائیں تو یہ دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ لوگ اندھیرے میں بالکل سیاہ ہو چکے ہیں۔ پھر ایک لمحہ ضائع کئے بغیر میں نے اپنی لاش کو اپنے کندھے سے اُتارا اور اُسی چوراہے پر اُسی جگہ لٹا کر اُسی طرف دوڑتا چلا گیا، جدھر سے میں آیا تھا۔

☆☆☆

بابا کبوتر والا

ٹورنامنٹ سے ایک دن قبل بابا کبوتر والا میرے گھر آیا اور مجھ پر دباؤ ڈالا کہ میں اپنی مادہ کبوتر اُس کے ہاتھوں فروخت کر دوں۔ لیکن مجھے اس کے پرفارمینس پر پورا بھروسہ تھا کہ موسم میں تھوڑی بہت بھی خنکی رہی اور آسمان صاف رہا تو چھ سات گھنٹے کا وقت تو وہ نکال ہی لے گی۔ ہر کسی کی نظریں بھی اُس پر ٹکی ہوئی تھیں۔ بابا کبوتر والا کی اجارہ داری اس میدان میں دس سالوں سے چلی آ رہی تھی۔ لیکن میری مادہ کبوتر کی اڑان کے باعث اس کے دل میں خطرے کی گھنٹی رُک رُک کر بجنے لگی تھی۔ ویسے تو وہ پہلے بھی کئی بار میرے یہاں آ چکا تھا۔ لیکن میری شادی کے بعد آج وہ پہلی بار آیا تھا۔

''شاہ جی! سُنا ہے کہ اس ٹورنامنٹ میں تم کوئی لکھنوی کبوتر اُڑا رہے ہو؟'' میری بیوی کے ہاتھوں سے چائے لیتے ہوئے وہ گویا ہوا۔

میں نے چاندنی میں دُھلی دُھلائی بالکل سفید، کالی آنکھوں والی تارمکوا مادہ کو پکڑ کر سامنے والی کرسی کے ہینڈل پر بٹھا دیا۔

''پانچ چھ ماہ قبل آخری بار جب میں یہاں آیا تھا، تب تو یہ نہیں تھا۔''

''نہیں!، میرے لکھنوی سسُر کو

میرے شوق کا علم تھا۔اس لئے تحفے میں انہوں نے مجھے یہ عنایت کیا۔

''لکھنوی کبوتر کا بھائی کوئی جواب نہیں......؟''اس کے ان تعریفی کلمات پر میری بیوی اندر ہی اندر مسکرا کر رہ گئی۔

''لیکن تم کیا اُڑا رہے ہو۔''میں نے پلٹ کر پوچھا۔

''اِسے صرف ایک اتفاق سمجھئے کہ میں نے بھی اڑان کے لئے تارا لکوا ہی تیار کیا ہے۔لیکن بے چارہ بہت دنوں سے پھوٹ پڑا ہے۔تمہاری اس مادہ کو دیکھ کر یہ خیال آیا کہ اس کا جوڑا اس کے ساتھ ہنڈریڈ پرسینٹ فٹ بیٹھے گا۔اِسے تم مجھے دے دو۔قیمت جو بولو۔''

''تم بھی تو بہت دنوں سے پھوٹ پڑے ہو۔کب لا رہے ہو اپنے جوڑے کو؟''

''میں جس نسل کا کبوتر ہوں اس کا جوڑا جلدی ملتا نہیں۔''پھر وہ میری بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا۔''بھابی جان!اگر آپ کو کہیں کوئی نظر آجائے تو بتا دیجئے گا۔بندہ حاضر ہے۔

بابا کبوتر والا کے جاتے ہی شہ زینہ نے مجھے آڑے ہاتھوں لے لیا۔''جب وہ اتنی ضد کر رہا ہے تو دے دیجئے۔ابّو جان سے کہہ کر میں دوسرا منگوا دوں گی۔''

''اور کل اُسے وہ بھی پسند آ گیا تو......آج یہ تارا لکوہ مادہ ہی میری عزت کے پنکھ ہیں۔بابا کبوتر والا میرے لمبے اور سنہرے پنکھ کاٹ کر سارے آسمان پر اپنا قبضہ برقرار رکھنا چاہتا ہے۔لیکن اس بار دس سالوں سے چلی آ رہی لمبی اور اونچی اُڑان کی اس جنگ میں اس کی شکست یقینی ہے۔وہ اپنی شکست اور بے عزتی سے بچنے کے لئے اونچی اُڑان کے اس کبوتر کو مجھ سے چھین لینا چاہتا ہے۔سنا ہے کہ اس نے باز بھی پال رکھا ہے۔ٹورنامنٹ جیتنے میں ہر بار باز نے اُس کی مدد کی ہے۔لیکن پرمان اب تک نہیں مل پایا ہے کہ اس نے ہی باز کو اس دن آسمان میں اُڑایا تھا۔

''تمہیں کس نے منع کیا ہے باز پالنے سے......''

''میں دھوکے کے پنکھ لگا کر آسمان میں اپنی فتح کا پرچم نہیں گاڑنا چاہتا۔''

''لیکن آسمانی جنگ میں آج سب جائز ہے۔'' بابا کبوتر والا میری نظر میں کچھ بھی غلط نہیں کر رہا ہے۔ وہ وقت کا نباض ہے۔ تمہیں اس سے یہ ہُنر چُرانا چاہیئے۔'' شہزینہ نے دبے لفظوں میں بابا کبوتر والا کی طرف داری کر کے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ لیکن اس کے بعد بھی میں نہ تو دھوکے پنکھ لگا پایا اور نہ ہی باز کو پالتو بنانے کا ہنر ہی سیکھ سکا۔

ایک دن جب میں دفتر سے گھر لوٹا تو آنگن میں ایک کبوتر کو خون میں لت پت پایا۔ اس کا ڈائنا باز کی مار سے بُری طرح زخمی تھا۔ میں نے اس کی مرہم پٹی کی اور وہ کچھ ہی دنوں میں ٹھیک ہو گیا۔ پھر میں اس کی تنہائی کا ساتھی ڈھونڈ نے کبوتر بازار پہنچا۔ وہاں ایک کونے میں ایک شخص چار پانچ پر بندھے ہوئے کبوتروں کو اپنی موٹر سائکل کے ہینڈل پر بٹھائے، دونوں طرف ٹانگیں کیے بیٹھا تھا۔ لمبا چھریرا جسم، گورا رنگ، لبوترہ چہرہ جس پر چیچک کے چھوٹے چھوٹے داغ، باز جیسی چمکتی آنکھیں، لمبی اور آگے کی طرف جھکی ہوئی ناک، گلے میں سونے کی چین جس پر لٹکتا ہوا کبوتر نما لاکٹ، گھنگھریالے بال اور لمبے لمبے ناخن۔ میں نے اس سے اپنے نر کے لئے ایک مادہ خریدا۔ یہ بابا کبوتر والے کے ساتھ چار سال قبل ہوئی میری پہلی ملاقات تھی۔

اس کے بعد کبوتروں کے ساتھ میں بھی کبوتر بن گیا۔ اتوار کے دن سارے کام دھام چھوڑ کر میں اُڑتا ہوا بازار پہنچ جاتا۔ وہاں پرانے اور نئے کبوتر بازوں سے ملتا۔ ان سے میل جول بڑھاتا۔ اُن کی ڈینگیں سنتا۔ مجھ پر ایک نشہ سا چھا جاتا۔ خوب مزا آتا۔

کبوتروں کے رہنے کے لئے کابُک میں نے خود تیار کیا۔ بلّی کے پنجوں سے محفوظ رکھنے کے لیئے دروازے لگا کر دو کیلوں کے سہارے برآمدے کے سامنے چھجّے کے نیچے اُسے ٹانگ دیا۔ اور اس کے بیٹھنے کے لئے بانس کی پھچیوں کی مدد سے چھتری بنا کر اُسے آنگن کے ایک کونے میں کافی اُونچائی پہ گاڑ دیا۔ صبح سے شام تک میں غٹرغوں، غٹرغوں کی آوازیں سنتا رہتا۔ جب بھی کلسیرہ نر غٹرغوں، غٹرغوں کرتے ہوئے اپنے جسم کو پھلاتا اور گردن موٹی کر کے گول گول گھومتے ہوئے اپنی دُم کو پھیلاتا اور اُسے رگڑتے ہوئے جب غوں غوں کر کے اپنی پھولی ہوئی گردن نیچے سے اُوپر اٹھاتا تو پھلسیرہ مادہ اپنے پروں کو پھُلا کر

تھوڑی اور موٹی ہو جاتی۔ کچھ دور تک وہ جھوم جھوم کر چلتی رہتی۔ پھر نر کے ساتھ چونچ میں چونچ میں ملاتے ہوئے وہ جھٹ سے اُس کے آگے بیٹھ جاتی........پھر دونوں پھڑ پھڑا کر اُڑ تے اور ایک دو چکّر لگانے کے بعد چھتری پر آ کر بیٹھ جاتے۔

جب کبوتر کا بُک میں تنکے جمع کرنے لگے تو ایکGynocologist کی بھومیکا نبھاتے ہوئے میں نے مادہ کا چیک اپ کیا۔اس کے پیٹ کے نیچے کے دونوں کا نٹے اپنی جگہ سے تھوڑا ہٹ جانے کی وجہ سے میری انگلی اس کے بیچ آرام سے دھنس گئی۔اُس دن میں بہت خوش تھا۔

پہلے دن سے لے کر اکیسویں دن تک دونوں باری باری سے انڈے سیتے رہے۔ بائیسویں صبح کا بُک کا دروازہ کھُلتے ہی دونوں پھڑ پھڑ کرتے ہوئے چھتری پر چلے گئے۔ میں نے کرسی کی مدد سے کا بُک کے اندر جھانکا۔جگہ جگہ سے انڈے کریک کر گئے تھے جیسے بھر بھری اور گیلی مٹی کے اندر سے ابھی ابھی کیڑا ارینگ گیا ہو۔دو پہر ہوتے ہوتے ہلکے گلابی گوشت پوست کے دو لوتھڑے چوں چوں کرنے لگے اور ہر چوں چوں پر باری باری سے نر اور مادہ چونچ میں چونچ ڈال کر اُسے دانے کھلاتے رہے۔ایک دو ماہ کے بعد یہ پٹّھے بڑے ہو گئے۔ پھر بازوؤں کے پُرانے پنکھ جھڑنے لگے۔نئی کلیاں کھلنے لگیں۔ایک سے دس تک کی گنتی دیکھتے دیکھتے ختم ہو گئی۔ پھر اُس نے بھی انڈے دئے۔ کبوتر۔انڈے۔انڈے۔ کبوتر۔اور سال دو سال کے اندر پورا کر کبوتروں کی آماجگاہ بن کر رہ گیا۔کلسیرہ، پھلسیرہ، للسیرہ، تارا، ملوہ، ہرا، جگ، کل دُمہ، گروا، لوٹن، لقا اور.......اوران ہی کبوتروں میں سے کچھ کے پاؤں میں کڑے تھے تو کچھ نے اپنے پاؤں میں گھنگھرو باندھ رکھے تھے۔ کچھ کے ڈائینے کے اندرونی حصّے رنگے ہوئے تھے تو کچھ نے پنکھ باندھ رکھے تھے۔ کچھ کے پر کاٹے گئے تھے تو کچھ کے پر جالی دار تھے۔

اب راتوں رات میرا شمار شہر کے کبوتر بازوں میں ہونے لگا۔صبح سے شام تک میرے یہاں کبوتر پریمیوں کی بھیڑ ہوتی۔ کچھ کبوتر خریدنے آتے تو کچھ اُڑان دیکھ کر محظوظ ہوتے اور کچھ اس طرح کے دلچسپ سوالات کرتے کہ جواب دیتے ہوئے مزا آ جاتا۔

ڈیوٹی کے بعد میرا سارا وقت کٹہل پیڑ کی چھاؤں میں گزرتا۔ وہاں سے بیٹھے بیٹھے میں کبوتروں کی اُڑان دیکھا کرتا۔ بادل بند ہوتے وقت میری آنکھیں آسمان سے لگ جاتیں۔ اس کے اُڑنے اور اُترنے کے ٹائم کو کاپی میں نوٹ کرتا۔ ہر روز کبوتروں کو گننا۔ ڈر بے صاف کرنا۔ گندے پنکھوں کو اُکھاڑنا۔ مادہ کو پکڑ کو نر کو للچانا اور اپنے ہاتھوں میں بُلا اُس سے غٹرغوں کے نغمے سُننا۔ مادہ کا پھول جانا اور نر کا دُم رگڑنا۔ ان سب چیزوں کے امتزاج سے ہی جیسے ہی میری زندگی کی تشکیل ہوئی تھی۔

ایک سال قبل جب میں دفتر کے کام سے لکھنو گیا تو چچا کے یہاں ایک دن قیام رہا۔ کبوتروں کی پھڑ پھڑاہٹ اور غٹرغوں کی آواز سے میری آنکھ صبح بہت جلد کھُل گئی۔ میں نے سوچا باہر نکل کر کبوتر بازی کا رعب جمایا جائے۔ لیکن جیسے ہی آنگن میں پہنچا تو خود کو حیرت زدہ پایا۔ گلابی شلوار قمیص میں ایک حسین و جمیل دوشیزہ کبوتروں کو دانے چھینٹ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اُس کے ہاتھ رُک گئے۔ مُٹھّی بند ہوگئی۔ شمعی اُنگلیوں میں کچھ دیر ارتعاش رہا۔ پھر وہ کچھ سوچتے ہوئے سارے دانے پھینک کر آدھے دوپٹے کو سنبھالے شرماتے ہوئے میرے سامنے سے گزر گئی۔

ناشتے کی ٹیبل پر میں نے اُسے ایک بار پھر دیکھا۔ وہ نہا دھو کر سفید شلوار سوٹ میں ناشتہ نکال رہی تھی۔ چچا نے بتایا کے تمہارے والدین کو اللہ جنت نصیب کرے۔ بہُت چڑھتی تھی اُنہیں

کبوتروں کی کندگی سے۔ تم مجھ پر گئے ہو۔ اِس بڑھاپے میں مجھ سے زیادہ کبوتروں کی دیکھ بھال شہزینہ کرتی ہے۔'' اُس وقت میری چور آنکھیں شہزینہ کی طرف اُٹھی ہوئی تھیں۔ وہ بھی میری طرف نظریں بچا کر دیکھ رہی تھی۔ اُس وقت ایسا لگا کہ جیسے میری زندگی کی اونچی اُڑان کے لئے مجھے اس سے اچھی کبوتری نہیں مل سکتی۔ بالکل سفید۔ تارا کی مانند۔

شہزینہ نے میرے دل کے آنگن میں قدم رکھتے ہی کا ٹک کی چابیاں سنبھال لیں۔ مجھے اپنی پسند پر ناز تھا۔ وہ ہر آنے جانے والے کا مجھ سے زیادہ خیال رکھتی۔ ٹور نامنٹ میں حصّہ لینے کے لئے اُس نے ہی مجھے اُکسایا تھا۔ اُڑان کے لئے تارا مکوا مادہ کا

انتخاب بھی اُس کا کیا ہوا تھا۔ وہ مجھے بابا کبوتر والا کے روپ میں دیکھنا چاہتی تھی۔ چاہتی تھی کہ سارے آسمان پر اب میرا قبضہ ہو۔ اور وہ بھی میرے ساتھ آسمان کی اُونچائیوں پر میرے ساتھ اُڑ سکے۔

میں نے تارا مکوا مادہ کی اُڑان پر ابھی کچھ ہی دن دھیان دیا تھا کہ وہ میرے دھیان کا کیندر بنتی ہی چلی گئی۔ دو تین گھنٹے اُڑنے والے کبوتر تو میرے پاس پہلے ہی سے تھے۔ جب تارا مکوا اپنے ساتھی کبوتر کے ساتھ نیچے اُترنے لگتی تو میں دوسرا کبوتر اُڑا دیتا۔ چھوٹے چھوٹے چکر کاٹتا ہوا وہ اُوپر اُٹھتا۔ اور تارا مکوا مادہ سے جا کر مل جاتا۔ اس کے بعد ایک بار پھر وہ دوسرے ساتھ کبوتر کے ساتھ آسمان کی اونچائیوں کو اپنے پروں پر جھکانے کے لئے تازہ دم ہو جاتی۔

ٹورنامنٹ سے دس پندرہ دن پہلے سے اُس نے چھ سات گھنٹہ ٹائم دینا شروع کر دیا تھا۔ بچے ہوئے وقت میں اضافے کی گنجائش ابھی باقی تھی کہ شبابی اُڑان کا جوش اُس کے بازوؤں کے ایک ایک پنکھ میں کروٹیں لے رہا تھا۔

ٹورنامنٹ میں کل دس کبوتر بازوں نے حصہّ لیا۔ مجھے چھوڑ کر سارے لوگ پرانے تھے۔ ٹورنامنٹ کے اصول وضابطے کے مطابق نئے انٹری لینے والے کو سب سے پہلے اور دفاع کرنے والے کو سب سے آخر میں موقع دیا جانا تھا۔

ٹورنامنٹ کے پہلے ہی دن تو قریب ساڑھے پانچ بجے صبح سارے لوگ میرے گھر آ دھمکے۔ چھ بجے تارا مکوا مادہ کے پاؤں میں شناختی دھاگا باندھنے کے بعد میں نے اُسے پوری طاقت سے آسمان کی طرف اُچھال دیا۔ چھوٹے چھوٹے دائرے بناتی۔ پلٹی پر پلٹی کھاتی۔ وہ ہماری آنکھوں سے کچھ ہی دیر میں اوجھل ہو گئی۔ قریب ڈھائی گھنٹہ بادل بند کے بعد بابا کبوتر والا کی باز جیسی تیز آنکھوں نے اُسے ڈھونڈ نکالا۔ وہ آسمان کی طرف انگلی کے اشارے سے ہم سبھوں کو دکھا تار ہا۔ لیکن کسی کو نظر نہیں آیا۔ آخر کار میری بیوی کو کامیابی نصیب ہوئی۔ وہ بابا کبوتر والا کی انگلیوں سے بنی اشارے کی سیڑھی کے سہارے جلد ہی بادلوں کے نگر میں پرویش کر گئی۔ دونوں بہت دیر تک ایک دوسرے کو دیکھتے اور دکھاتے

رہے۔ہم سب دونوں کی تیز آنکھوں پر حیران ہوئے۔ پھر ایک گھنٹہ کی مسلسل جد وجہد کے بعد سیاہ بادلوں کے نہ بیچ جھلمل جھلمل کرتے ہوئے تارا کو ہم نے بھی ڈھونڈ لیا۔

چائے پانی اور ناشتے کا دور چلتا رہا۔ وقت گزرتا رہا۔ اور ایک ڈر سر اُبھارتا رہا کہ کہیں دوسرے کبوتروں کی طرح یہ بھی باز کا نشانہ نہ بن جائے۔ لوگ دعائیں مانگ رہے تھے۔ میں بھی ہاتھ اُٹھا کر صحیح سلامت چھتری پر اس کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا کہ بابا کبوتر والا یہ کہہ کر مجھے دلاسہ دیا۔

''بزدل کبوتر ہی باز کی گرفت میں آتے ہیں۔ دس سال میں اُس کا ایک بھی کبوتر باز کا لُقمہ نہیں بنا ہے۔ اور آج موسم صاف ہے۔ اس لئے باز کی گرفت میں آنے کا سوال ہی نہیں اُٹھتا۔

بابا کبوتر والا کی بات سچ ثابت ہوئی۔ تارا مکوا مادہ ۶ رگھنٹہ بارہ منٹ کی لمبی اُڑان کے بعد صحیح سلامت چھتری پر لوٹ آئی۔ اُس وقت سب کی حیران آنکھیں بابا کبوتر والے کی طرف اُٹھی ہوئی تھیں اور بابا کبوتر والا کی چمکتی آنکھیں چھتری سے اُلجھی ہوئی تھیں۔

دوسرے.......

تیسرے........

پانچویں........

اور لگا تار نویں دن تک آسمان میں کئی ایک کبوتروں نے اپنی قوت پرواز کا مظاہرہ کیا۔ لیکن کوئی بھی پانچ کے نمبر سے اُوپر اُڑان کی سوئی نہیں لے جا سکا۔ اب سب کی نظریں بابا کبوتر والے پر لگی تھیں۔ جب کہ پچھلے ریکارڈ سے یہ صاف ظاہر تھا کہ اس بار اسے شکست ملے گی۔ لیکن شیطانی دماغ سے سب خوف کھائے بیٹھے تھے۔

دسواں اور آخری دن.......

ہم سب ساڑھے پانچ بجے کے قریب بابا کبوتر والا کے گھر پہنچے۔ وہ برآمدے کے باہر کرسیاں لگائے اُداس بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی پھٹ پڑا۔ ''تارا مکوا نر کو نہ جانے کس کی نظر لگ گئی۔ آٹھ دس دنوں سے وہ ٹھیک سے نہ کچھ کھا تا تھا اور نہ ہی ٹائمنگ دے رہا

تھا۔ دو تین دنوں سے وہ گھر کے دو چار چکر لگا کر چھتری پر بیٹھ جایا کرتا تھا۔ میرے کافی ہَش ہُش کرنے کا بھی اس پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ آج صبح کا ٹک کا دروازہ کھولتے ہی وہ ہمیشہ کی طرح چھتری پر جا کر بیٹھ گیا۔ میرے دانہ دینے سے پہلے نہ جانے وہ اُڑ کر کہاں چلا گیا۔ کافی دنوں سے پھوٹ پڑا تھا۔ لگتا ہے کسی مادہ کے چکر میں اُس نے........ وہ اپنے آنسوؤں پر قابو پاتے ہوئے مجھے اپنے گلے سے لگا لیا۔

''شاہ جی! تمہیں میری طرف سے ٹورنامنٹ جیتنے پر بہت بہت مبارک باد۔''

طے شدہ پروگرام کے مطابق دوسرے دن ایک چھوٹے سے ہال میں جہاں شہر کے چھوٹے بڑے پچاسوں کبوتر باز موجود تھے وہیں مصروفیت کے باعث کچھ لوگ شریک نہیں ہو پائے۔ ان میں بابا کبوتر والا کی کمی مجھے سب سے زیادہ کھل رہی تھی۔

پانچ ہزار کے انعامی چیک اور کبوتر بنے شیلڈ کے ساتھ میں نے اپنی کھٹارا موپیڈ گاڑی جیسے ہی گھر کے پاس روکی، ہمیشہ کی طرح میری نگاہ چھتری کی طرف اُٹھ گئی۔ یکا یک آنکھوں کی پُتلی سفید ہوگئی اور سامنے گھنا اندھیرا پھیل گیا۔

میری تارا مکوا مادہ کسی دوسرے تارا مکوانر کے ساتھ چونچ میں چونچ ملا رہی تھی۔

آگے میں کچھ اور نہیں دیکھ سکا۔

☆☆☆

بیوٹی پارلر میں کھڑی ایک لڑکی

''یہی تو میں تمہیں سمجھانا چاہتی ہوں کہ جب ساری دنیا بیوٹی فلیشن کے پیچھے مر رہی تو ایسے میں اگر میں اپنی کوکھ کا بیوٹی فلیشن کروالوں تو اس میں برائی کیا ہے؟''

''کہیں تم پاگل تو نہیں ہوگئی؟''

''ذرا سوچو! کل ہم دو سے تین ہو جائیں گے۔''

''تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟''

''کل ہو کر پڑسکتا ہے۔''

''وہ کیسے....؟''

''رنگ و نسل دونوں کا۔ اور یہی ہمارے لئے مستقبل کا سب سے بڑا سر درد ہوگا ۔اس لئے سوچتی ہوں کہ وقت سے پہلے سب کچھ صاف صاف بتا دوں کہ ہماری نسل سے ہی ہماری پہچان باقی رہے گی۔''

''لیکن تم چاہتی کیا ہو؟''

''بستر پر تم ساتھ رہو......لیکن کوکھ میں......''

''آخر کیوں.....؟''

''تمہاری طرح میرے بچّے بھی سیاہ فام ہو گئے تو کل اُن کا مستقبل کیا ہوگا؟ اس کے بارے میں تم مجھ سے کہیں بہتر جانتے ہو۔ اس لئے کہ تم اس رہگزر سے بخوبی واقف ہو۔ سارے پر ابلمس کو جھیل چکے ہو۔ کیا تم چاہتے ہو کہ تمہارے بچّے بھی تمہاری طرح اونچی کرسیوں اور عہدے کی بھوک میں اپنی ساری زندگی فُٹ پاتھ پر گُزار دیں؟''

''تو پھر کیا تم بچّے کو جنم دے کر دودھ میں نہلاؤ گی؟''

''ہاں! لیکن یاد رہے کہ وہ دودھ تمہارا نہیں ہوگا۔''

''تو اس کا مطلب ہے کہ تم کسی دوسرے کے ساتھ......''

''نہیں میں ایسا نہیں کروں گی۔''

''تو پھر کیا آسمان سے سیدھے کوئی تمہاری کوکھ میں آ گرے گا.....؟''

''نہیں! میرا مطلب ٹیسٹ ٹیوب بے بی سے ہے۔''

☆

میری روز کا تعلق ایک جنگجو گھرانے سے تھا۔ اُس کا باپ ''وہائٹ ہارس'' کے نام سے ایک خفیہ تنظیم چلایا کرتا تھا۔ اس کے ہزاروں ممبر دنیا بھر میں پھیلے ہوئے تھے۔ جنہیں اس بات کی ٹریننگ دی گئی تھی کہ ''سیام فام لوگوں کو ہر محاذ پر اتنا ستایا جائے کہ وہ سب زندگی سے بے زار ہو کر اپنی موت مر جائیں۔ سیاہ فامیوں پر ایک الزام یہ بھی ہے کہ اس سے ہمارا گوڈ خوش نہیں ہے۔ اس لئے اسے آسمان سے نکالتے وقت آگ کی بھٹّی میں ڈال دیا گیا تا کہ دھرتی پر ہم انہیں پہچان سکیں اور سزا دے سکیں۔ سزا غلامی ہے۔ یہ غلام ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ آزادی کا خواب دیکھنے والوں کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند کر دی جائیں گی۔''

میری روز اِس تنظیم کی سرگرم رُکن تھی۔ وہ بھی اپنے باپ کی طرح سیاہ فامیوں کی دشمن تھی۔ سر اٹھانے والے سیاہ فامیوں کا وہ سرے سے صفایا چاہتی تھی۔ اس کارِ خیر کے لئے وہ بار ہا منصوبے بناتی۔ منصوبے بنتے اور بگڑتے رہے۔ ادھر اس کی بے چینی میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا کہ اچانک ایک دن وہ کچھ سوچتے سوچتے خوشی سے اُچھل پڑی۔ اس لئے کہ اس بار اس کا منصوبہ ہی کچھ اور تھا۔

اپنے اس منصوبے کے تحت دوسرے ہی دن وہ اپنے ڈیڈ سے مل کر ''بلیک ہاؤس ایسوسی ایشن'' کے صدر کے گھر پہنچی۔ البرٹ نارمن نے میری روز کے ہمراہ ڈیلی گیشن میں آئی تمام لڑکیوں کا شاندار استقبال کیا۔

باتوں کا آخری دور دونوں فریقین کے لئے کافی اہم رہا۔

''البرٹ نارمن سے مجھے ایسی امید قطعی نہیں تھی۔''

''بات صرف اتنی ہے میری روز جی! کہ ہم لڑنے والے نہیں ہیں۔ اگر ہمارا حق مل جائے تو پھر لڑائی کیسی......؟''

''رنگ اور نسل کے فرق سے کیا ہوتا ہے حقیقت میں ہم سب تو ایک ہیں۔''

''میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ جب پہل آپ کی طرف سے ہوئی ہے تو آخری دم تک شانتی کے اس پرچم کو اپنے ہاتھوں سے گرنے نہیں دوں گا۔''

رنگ و نسل کی یہ لڑائی یہاں آکر تھم گئی۔ لیکن منصوبہ بند طریقے سے لڑائی پہلے کی طرح ہی جاری رہی۔ میری روز کو جب بھی موقع ملتا وہ ''بلیک ہارس ایسوسی ایشن'' کے دفتر پہنچ جاتی۔ گھنٹوں البرٹ نارمن سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی۔ کبھی باتوں کی دنیا میں ایک شرابی کی طرح بہک جاتی تو کبھی سنبھل سنبھل کر ایک رہنُما کی طرح باتوں کی میٹھی سڑک پر چلنے لگتی اور ساتھ ہی ساتھ ایک شاطر کی طرح محبّت کے چاروں حروف کو نچوڑ کر لفظ لفظ رس اس کے کانوں میں ٹپکاتی جاتی۔ البرٹ نارمن مدہوش پر مدہوش ہوتا رہتا۔ ایک دن عالمِ مدہوشی میں وہ جھوم اُٹھا۔

''تم بہت اچھّی ہو میری روز۔''

''میں! وہ کیسے......؟'' وہ ہنسنے لگی تھی۔

''جب سارے گورے نفرت کرنے لگے تو محبّت کا چاند بن کر تم نے دل کے آسمان میں جنم لیا اور میرے وجود کو چاندنی سے منوّر کر دیا...'' یہ کہتے ہوئے البرٹ نارمن نے میری روز کا نرم و نازک ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اُسے آہستے سے دبا دیا۔

''محبّت کا ارتھ جانتے ہو۔؟'' ادائے دلبری سے اپنا ہاتھ کھینچتے ہوئے میری روز

سراپا محبت بن کر البرٹ کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

''بھلا یہ کون نہیں جانتا؟'' البرٹ نارمن نے مسکراتی آنکھوں سے اس کے سراپا کا جائزہ لیا۔

''اور شادی......؟'' وہ اِٹھلاتی ہے۔

محبّت کی اگلی منزل......'' البرٹ نارمن کھلکھلا کر ہنس پڑتا ہے۔

پھر دونوں اس منزل سے اگلی منزل کی طرف کچھ اس تیزی سے بڑھے کہ رنگ و نسل کی دنیا حیرت زدہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

☆

دونوں کے درمیان ٹیسٹ ٹیوب بے بی سے متعلق کافی لمبی چوڑی بحثیں ہوئیں۔ البرٹ نارمن پہلے تو کسی بھی قیمت پر یہ ماننے کے لئے تیاّر نہیں تھا۔ لیکن جب بار بار باتوں کے محور پر نسل کی خوشحالی کو گھُما گھُما کر اُسے سمجھانے کی کوشش کی اور آخر میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تب البرٹ نارمن اچانک خود کو بھٹّی میں چڑھے ہوئے لوہے کی طرح محسوس کرتا ہے اور آہستہ آہستہ پگھلتا ہوا اپنے آپ کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا بھی رہتا ہے۔

''اگر تم سمجھتی ہو کہ ہمارے بچّے کا مستقبل اسی میں ہے تو میں تیاّر ہوں۔''

ہسپتال کا ایئر کنڈیشن کمرہ شیشے کا ہے۔ البرٹ نارمن ہسپتال کے سینئر ڈاکٹر کے ہمراہ ٹیسٹ ٹیوب کے متعلق جہاں سنجیدگی کے ساتھ بات چیت میں مصروف ہے، وہیں میری روز دنیا و مافیہا سے بے خبر کیٹ لاگ دیکھنے میں منہمک۔ ہر صفحہ پر بے شمار اسمارٹ مردوں کی تصویریں ہیں۔ بائیوڈاٹا بھی درج ہے۔ صفحہ پر صفحہ وہ پلٹتی جاتی ہے۔ چہرے پر چہرہ بدلتا جاتا ہے۔ ایک ایک کر کے اس کے سامنے خوبصورت اور دلکش چہرے گھومتے رہتے ہیں۔ اچانک ایک چوڑے چکلے سینے اور بھوری آنکھوں والے لمبے چھریرے قد کے نوجوان پر نظر پڑتے ہی اس کی باچھیں کھل اُٹھتی ہیں۔ پھر اس کے جسم کے مخصوص حصّے میں لرزش پیدا ہوتی ہے۔ وہ خود کو سنبھالتی ہے اور سنبھل سنبھل کر کوکھ کی نظروں سے بائیوڈاٹا کو پڑھتی ہے۔ اس کے بعد ایک بار پھر وہ اپنی متلاشی آنکھیں اس کے چہرے پر مرکوز کر دیتی

ہے۔دفعتاً اس کی کوکھ کی دیواروں میں گُدگُدی سی ہونے لگتی ہے۔جیسے کوئی کیڑا رینگ رہا ہو۔جیسے کوئی گرم گرم سیّال اس کے وجود میں تیرتا ہوا اس کے سانچے میں ڈھل رہا ہو۔جیسے........پھر وہ شناختی کارڈ ڈاکٹر کی طرف بڑھاتے ہوئے چہک اُٹھتی ہے۔

''میرا چوائس کیسا ہے ڈاکٹر؟''

ڈاکٹر البرٹ نارمن کی طرف دیکھتے ہوئے مسکراتا ہے۔

''بہت خوب۔''

پھر ٹیسٹ ٹیوب بے بی سے متعلق بہت سارے ٹیسٹ سینئر ڈاکٹر کی نگرانی میں لئے جاتے ہیں۔ساری رکاوٹوں اور پریشانیوں کو ڈاکٹر اس کی خواہش کے عین موافق بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔جب میری روز کو معلوم ہوتا کہ اس کے آنگن میں پسند کا پھول کھلنے والا ہے تو اس کی خوشی ہواؤں کا زینہ طے کرتی ہوئی آسمان کی بلندیوں کو چھونے کے لئے بے تاب نظر آتی ہے۔دوسری طرف البرٹ نارمن کے چہرے پر اُدسی کی ہلکی سی پرت جمی ہوئی ہے۔لیکن اس کے اندر سے کہیں کہیں خوشیاں بھی جھانک رہی ہیں اور وہیں کہیں سوچ کی آڑی ترچھی لکیریں بھی کھینچی ہوئی ہیں جو کبھی کبھی چہرے کے اُتار چڑھاؤ کے باعث آئینے میں بال کی مانند دکھائی پڑ جاتی ہیں۔

''کیا سوچ رہے ہو؟''

''سوچ رہا ہوں کہ جس بچّے کو تم جنم دوگی وہ مجھے باپ کہے گا یا نہیں.....؟''

''کیوں نہیں کہے گا۔اور بھلا اسے پتا ہی کیسے چلے گا یہ سب کچھ......''

''لیکن مجھے تو پتا ہے۔پھر کیا میں اُسے اپنا بیٹا تسلیم کر پاؤں گا،جس میں میرے خون کا ایک بھی قطرہ نہیں۔اُسے اگر اپنا بیٹا مان بھی لوں تو کیا اس شخص کو جس کا خون اُس بچّے کی رگ رگ میں دوڑ رہا ہوگا تم اُسے اپنا شوہر تسلیم کر پاؤ گی۔''

''شوہر کی حیثیت سے تو دنیا تمہیں جانتی ہے۔''

''لیکن اگر اس شخص کو معلوم ہو گیا کہ تم اس کے بچّے کی ماں بننے والی ہو تو وہ کس رشتے کی نظر سے تمہیں دیکھے گا؟''

''یہ تو وہی بتا سکتا ہے....؟''

''لیکن تم اپنے اور اپنے بچّے کے بارے میں تو بتا سکتی ہو۔ کیا نام دو گی اُس کو .....؟ میرا مطلب ہے باپ کی جگہ میرا یا اُس کا.....؟''

''تمہارا۔''

''لیکن میں اُس بچّے کا باپ نہیں ہوں۔''

''لیکن تمہاری ہی بیوی اُس بچّے کی ماں ہے۔''

''یہ تو بچّے کے ساتھ سراسر ناانصافی ہوگی۔ بیٹا کسی کا اور نام کسی کا.....''

''چوں کہ ہم سب مل کر دنیا کا بیوٹی فکیشن کر رہے ہیں۔ اس لئے نام اور کام میں کیا رکھا ہے۔''

''کیا تم ایسا سوچتی ہو کہ ایک اکیلی عورت کے یہ سب کچھ کرنے سے دنیا بیوٹی فائی ہو جائے گی؟''

''پہلے اس دنیا میں صرف آدم آئے۔ اس کے بعد دنیا خود بخود آگے بڑھ گئی۔'' یہ کہتے ہوئے وہ البرٹ نارمن سے اس بات کو چھُپا لیتی ہے کہ اس کی ایسوسی ایشن کی بہت ساری لڑکیاں اس کی طرح ہی شادی رچا کر خفیہ مشن کے تحت دُنیا کو بیوٹی فائی کرنے میں لگی ہوئی ہیں۔''

چاند آہستہ آہستہ اپنا سفر پورا کر رہا ہے۔ چودھویں کی رات آنے میں کچھ وقت ہے۔ لیکن اس کے باوجود تیّاریاں زور وشور سے جاری ہیں۔ اس تیّاری میں میری روز جس جوش وولولے کے ساتھ شامل ہے کچھ ویسا ہی جوش وخروش البرٹ نارمن کے اندر بھی مچل رہا ہے۔ ثبوت کپڑے کی خریداری ہے۔ بازار سے لوٹتے ہوئے البرٹ نارمن پوری طرح مذاق کے موڈ میں تھا۔

''یہ تو ٹھیک ہے کہ تمہیں سفید پسند ہے۔ اس لئے تم نے بچّے کے دونوں کپڑے کا رنگ سفید چُنا ہے۔ لیکن ایک چیز میں نے مارک کی ہے کہ دونوں میں ڈیزائن کالے کا ہے۔ تم ہر کالی چیز سے نفرت کرتی ہو تو ایسے میں اپنے بچّے کے لئے اسے کیسے پسند کر لیا؟''

''بدھو کہیں کہ اتنا بھی نہیں جانتے کہ گورے بچّوں پر وہائٹ اور بلیک کمبی نیشن کے کپڑے بہت کھلتے ہیں۔'' میری روز اپنے گورے چہرے کے قریب کپڑے کو لاتے ہوئے مسکراتی ہے۔

''اور کالے بچّوں پر......؟'' البرٹ نارمن اس کے ہاتھ سے کپڑا جھٹک لیتا ہے اور اپنے کالے ہاتھوں پر رکھ کر میری روز کی رائے جاننا چاہتا ہے۔

''وہ جواُن کی مائیں ہیں وہ جانیں۔''

''کالے بچّوں کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہوگا نا.....؟'' البرٹ نارمن مسکراتا ہے۔

''ہوگا تو ہوگا۔ مجھے اس سے کیا لینا دینا۔'' میری روز اُٹھ کر دوسرے کمرے میں جانے لگتی ہے۔

''جاننا چاہئے ایک ایسی عورت کو جس کے شوہر کا رنگ سیاہ ہے۔'' البرٹ نارمن ہاتھ پکڑ کر اُسے سامنے بٹھا لیتا ہے۔

''لیکن تمہارے رنگ وروپ سے میری کوکھ کے اس بچّے کا کیا تعلق؟'' میری روز کا ہاتھ ہوا میں تیرتا ہوا ٹھیک اس کے ناف کے اوپر آ کر ٹھہر جاتا ہے۔

''لگتا ہے تم نے اس افریقی عورت کا قصّہ نہیں سُنا ہے، جس کا شوہر بھی سفید نسل کا ہے لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس کے جڑواں بچّے میں سے ایک نیگرو ہے۔''

''وہ کیسے......؟''

''جیسے کالے رنگ کے ڈبّے میں تھوڑا سا سفید رنگ پڑ جائے تو کالا رنگ اُسے اپنے ساتھ اس طرح ملا لیتا ہے کہ سفید کا نام ونشان مٹ جاتا ہے، لیکن اگر سفید میں ایک بوند کالا ڈال دیا جائے تو وہ پھیل کر بھی کہیں نہ کہیں باقی رہ ہی جاتا ہے۔ جانتی ہو ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس لئے کہ بلیک ہمیشہ ڈومینینٹ کلر رہا ہے۔''

''لیکن مسٹر! یہ میری کوکھ ہے۔ رنگ کا ڈبّہ نہیں۔'' میری روز کے لہجے میں طنز کا پہلو نمایاں تھا۔

''ویسے تم مانو یا نہ مانو۔ لیکن تمہاری کوکھ بھی زندگی کے رنگ کا سفید ڈبّہ ہی ہے۔

اگر غلطی سے تھوڑا سا بھی کالا رنگ گر گیا تو جانتی ہو کیا ہوگا.....؟''البرٹ نارمن نے مسکراتے ہوئے اس کی گوری ہتھیلی پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور کھڑکی سے باہر بادلوں سے گھرے آسمان کو دیکھنے لگا۔

''نہیں میں نے خود سے کیٹ لاگ دیکھا تھا اور ڈاکٹر نے بھی وہی نمبر لاکر مجھ میں انجیکٹ کیا تھا۔اس لئے غلطی ہونے کا کوئی چانس ہی نہیں ہے۔''

باہر اندھیرا پھیل رہا تھا جو کھڑکی کے راستے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔میری روز تیزی سے اُٹھتی ہے۔پہلے کھڑکی بند کرتی ہے۔پھر ٹیوب لائٹ روشن کر کے مسکرانے لگتی ہے۔

☆

ڈلیوری کی تاریخ بھی وہی تھی۔اس دن میری روز کا بُرا حال تھا۔لیکن اس کے باوجود اُس کے ذہن کے ریس کورس پر وہائٹ ہارس پوری برق رفتاری سے دوڑ رہا تھا۔جسے دیکھ کر وہ بار بار مسکرا رہی تھی۔دوسری طرف کمرے کے باہر البرٹ نارمن عالم پریشانی میں اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔اور اس دوران کئی بار اس کے ذہن کے ٹریک پر وہائٹ ہارس کو گرا کر اُس کا بلیک ہارس آگے بڑھ گیا تھا۔اس وقت وہ خوشی سے تالیاں بجانے لگا تھا۔سینئر ڈاکٹر نے اس حرکت پر اُسے ڈانٹا بھی۔عین اُسی وقت اندر کے کمرے سے نکل کر ایک نرس نے البرٹ نارمن کو بتایا تھا۔''بیٹا ہوا ہے۔''ایک بار پھر اُسے لگا کہ فنیشنگ لائن تک پہنچتے پہنچتے وہائٹ ہارس کو گرا کر اس کے بلیک ہارس نے رنگ ونسل کی یہ دوڑ جیت لی ہے۔ایک بار پھر وہ زور زور سے تالیاں بجانے لگا تھا۔اس بار سینئر ڈاکٹر نے ڈانٹنے کے بجائے بڑی ہی گرم جوشی سے اس کا ہاتھ پکڑا اور اُسے مبارک باد دی۔اس کے جواب میں البرٹ نارمن اُن سے لپٹ گیا تھا۔پاگلوں کی طرح ان کے ہاتھ کو چومنے لگا تھا۔

دوسرے دن میری روز پوری طرح ہوش میں آگئی۔آپریشن ہوا تھا اس لئے درد سے اس کا پورا جسم ٹوٹ رہا تھا۔وہ اپنے اندر کمزوری محسوس کر رہی تھی۔لیکن اس حالت میں بھی وہ اپنے بچّے کی دیکھ بھال کر سکتی تھی۔اس لئے آج اس نے نرس سے کہہ کر اپنی جگر کے ٹکڑے کو منگوا لیا تھا۔بچّے کو اُس نے وہی سفید میں کالے ڈیزائن والا لباس پہنایا تھا۔جب

بھی بچّہ روتا میری روز اپنی چھاتی اس کی طرح بڑھا دیتی ۔ البرٹ کے آنے سے قبل وہ قریب تین چار بار دودھ پلا چکی تھی اور اب بھی پلا رہی تھی ۔

میری روز کے کیبن کا دروازہ آہستے سے چر چرا کر کھل گیا۔ سامنے البرٹ نارمن مسکرا رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں دودھ کا فلاسک تھا اور دوسرے ہاتھ میں پھل اور کپڑے کا بیگ ۔ میری روز کی نظر جیسے ہی البرٹ نارمن پر پڑی ۔ وہ پہلے کچھ شرمائی ۔ پھر اچانک اُسے کچھ خیال آیا۔ وہ دودھ پیتے ہوئے بچّے کو سفید چادر میں چھُپانے لگی ۔لیکن چادر بے وفا دوپٹے کی طرح اس کے سینے سے سرکتی چلی گئی ۔

البرٹ نارمن اب بالکل اس کے سامنے رکھے ہوئے ٹیبل پر بیٹھ گیا تھا۔ اُس کی آنکھیں میری روز کی چھاتی چوستے بچّے پر جیسے ہی پڑیں، چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اس کی آنکھوں میں تناؤ سا پیدا ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ سرخ ہو گئیں۔ میری روز اس سے پہلے کہ کچھ سمجھتی یا اس سے کچھ پوچھتی کہ اس نے دانت کچکچاتے ہوئے تیزی سے اپنا ہاتھ بچّے کی طرف بڑھا دیا۔ میری روز کے کمزور جسم میں پتا نہیں اس وقت اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی کہ اس نے فوراً ایک ہاتھ سے البرٹ نارمن کے ہاتھ کو زور سے پکڑ لیا۔

''یہ کیا کر رہے ہو تم .....؟'' میری روز کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئی تھیں ۔

''دُنیا کا بیوٹی فکیشن ......مجھے بھی ان کالے بچّوں سے .....'' یہ کہتے ہوئے البرٹ نارمن ایک بار پھر بچّے کی طرف تیزی سے جھپٹ پڑا۔

''لیکن میں تمہیں ایسا کرنے نہیں دوں گی ۔ کیوں کہ یہ میری کوکھ کا درد ہے۔ میرا اپنا خون ہے۔''

''میری روز اس کے ہاتھ کو زور سے پکڑے پکڑے زاروقطار رو پڑی۔

''لیکن یہ میرا خون تو نہیں ہے......'' اتنا کہتے ہی اُسے اندر سے ہنسی آ جاتی ہے۔ وہ بچّے کو بے تحاشہ چومنے لگتا ہے۔ ''میری! واقعی اس روز تمہاری باتوں میں کتنا دم تھا ۔ وہائٹ میں بلیک کا کمبی نیشن (combination) دیکھو آج کتنا جچ رہا ہے۔''

میری روز ہنس دیتی ہے۔ ☆☆☆

ننگی آنکھوں کی بھوک

''مرد وحشی درندے کی مہذب ترین شکل ہے۔لیکن عورت کو قریب پا کر کبھی کبھی وہ اس سے بھی زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے۔اس لئے تمہیں ڈور پر اپنی گرفت اور روشنی پر قابو رکھنا ہوگا۔ورنہ تمہیں ننگا کر کے روشنی کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگے گی۔''

شادی سے ایک دن قبل ،مرد کی ننگی آنکھوں کا شکار ہوئی ایک سہیلی نے جب اپنا دردِ غم سنا کر نصیحت کی تو کاجل نے بھی ان باتوں پر مضبوطی سے گانٹھ باندھ لی۔

شام ہو چکی تھی۔

ایک طرف عورتیں ہلدی لگا رہی تھیں اور دوسری طرف کاجل کے ذہن کا دائرہ پھیل رہا تھا۔لڑکیوں کے درمیان چھیڑ چھاڑ کا عمل جاری تھا۔ایک نے ہلدی لگانے کے بہانے ایسی جگہ ہاتھ رکھا کہ کاجل یکا یک چیخ اُٹھی۔

''نہیں۔نہیں۔''

پھر اس کے اعصاب خود بخود تنتے ہی چلے گئے تھے۔کچھ دیر میں وہ بے ہوش ہوگئی ۔جب ہوش میں آئی تو اس نے پھر چیخنا شروع کر دیا۔

''میں کہتی ہوں نہ کہ پہلے بتّی بجھاؤ۔''
گھر میں ہلچل مچ گئی۔ کسی نے جادو سمجھا تو جادوٹونا والے کو بُلا لائے۔ کسی نے بیماری جانا تو ڈاکٹر کو پکڑ لائے۔ اور کسی کو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا تو رونا دھونا شروع کر دیا۔ ایسا دورہ اسے کبھی نہیں پڑا تھا۔ اس لئے سب پریشان تھے۔ بہر حال ڈاکٹر کی دوا اور جھاڑ پھونک کرنے والے کے منتر نے آپس میں مل کر کچھ ایسا اثر دکھایا کہ گھنٹہ بھر کے اندر کاجل ہوش میں آ گئی۔ لیکن اس کے بعد بھی اس کے اعصاب میں کھینچاؤ سا ہوتا رہا۔ اور جب بھی اعصاب کے کھینچاؤ میں اضافہ ہوتا اس کے ہاتھ کا دباؤ کمر پر بڑھ جاتا اور نظر ٹیوب لائٹ کی طرف اُٹھ جاتی۔

قریب گھنٹہ دو گھنٹہ کے لئے جیسے کائنات کی ساری پریشانیاں اس کے وجود سے آ کر چپک گئی تھیں۔ لیکن جیسے جیسے وقت گذرتا جا رہا تھا اس کے کتابی چہرے سے پریشانی کے حروف مٹتے جا رہے تھے۔ جب وہ پہلی حالت میں چلی آئی تب اس نے اپنا فیصلہ ذہن کو سنا دیا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے لیکن وہ روشنی میں ڈور کو اپنے ہاتھوں سے نکلنے نہیں دے گی۔

کاجل ایک ضدّی لڑکی تھی۔ ماں باپ کی اکلوتی تھی اور لاڈ و پیار میں جوان ہوئی تھی۔ اس کی ہر چھوٹی بڑی ضد کو گھر والوں نے پورا کیا تھا۔ اس لئے جب کاجل نے اپنی زندگی کا فیصلہ گھر والوں کو سنایا تو گھر والے بھی اس کے اس فیصلے کو سُنی ان سُنی نہیں کر سکے ۔ مجبوراً ہاں کرنا پڑی۔ اس طرح سے پردیپ اس کی زندگی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چلا آیا۔

شادی کے دن بھی وہ اندھیرے اور اجالے کے درمیان الجھی رہی کہ کہیں میرے ساتھ بھی وہی سب ہو گیا تو۔؟ نہیں نہیں، پردیپ تو میرا اپنا ہے۔ وہ کبھی ایسا نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر اس نے بھی ایسا ویسا کچھ کیا تو.....؟

الجھن کی ایسی ہی کالی سڑک پر چلتے چلتے کاجل دوسرے دن سسرال پہنچ گئی۔

سہاگ کی رات صرف کاجل کے لئے ہی نہیں بلکہ ہر کسی کے لئے یادگار ہوتی ہے۔ اس لئے کاجل بھی سرخ جوڑے میں لپٹی سمٹی، ہنگاموں سے بے خبر پلکوں پر حسین خواب سجائے ایک ایسی مدھر چاپ کی منتظر تھی جو اس کی روح کے تار پر زندگی کا کوئی رس بھرا

گیت چھیڑ کر اسے اس طرح مدہوش کر دے کہ اس کے جسم کے مساموں سے محبّت رس رس کر ماحول کو عطر بیز کر دے۔

ابھی کاجل سوچ کی ریشمی ڈور میں اُلجھی ہوئی تھی کہ اس کے شہزادے کی مدھر چاپ سیج پر آ کر ٹھہر گئی۔ رسمی منہ دکھائی اور انگوٹھی سے جب بات آگے بڑھی تو کاجل کا چہرہ شرم و حیا اور خوشی و مسرّت کے حسین امتزاج سے اور بھی گلنار ہو گیا۔

''تمہارا نام کاجل کس نے رکھا۔؟'' پردیپ نے مذاق میں وہی جملہ دہرا دیا جس سے محبّت کی شروعات ہوئی تھی۔ اور ایسے میں کاجل نے وہی جواب دیا جو پہلی ملاقات میں مسکراتے ہوئے پردیپ کو دیا تھا۔

''بچپن میں لوگ مجھے چینی کی گڑیا کہا کرتے تھے شری مان۔!'' وہ ہنس رہی تھی۔''لوگوں کی نظر نہ لگ جائے اس لئے ماں ہر روز کاجل کی بندیا لگایا کرتی اور دیکھتی رہتی کہ بندیا ہے یا نہیں۔ مٹتے ہی دوبارہ لگا دیا کرتی۔ اس طرح گھر والوں نے مجھے کاجل کے نام سے ہی پکارنا شروع کر دیا تا کہ......''

''تا کہ دوسروں کی نظر نہ لگ جائے۔ ہے نہ یہی بات۔؟'' کاجل، پردیپ کی اس بات پر کھلکھلا اُٹھی۔''لیکن میری نظروں سے تم کہاں تک بچتی ....؟'' کاجل کے چہرے کا نچلا حصّہ پکڑ کر پردیپ نے اس کی بندیا پر اپنے گرم ہونٹوں کو رکھتے ہوئے کہا۔'' اور اب اگر تمہارے نام کی طرح یہ کمرہ بھی کاجل میں بدل جائے، تب تمہیں ڈر تو نہیں لگے گا.....؟''

پردیپ کی اس بات پر کاجل کیا کہتی: ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔ گالوں پر گڈھے بن کر ٹھہر گئے۔ ہنسی کی رم جھم بارش شروع ہوتے ہی کمرے کی ساری روشنی ٹیوب لائٹ میں سمٹ کر رہ گئی اور کمرہ تاریک ہو گیا۔ کمرے میں اندھیرے کی سلطنت جیسے ہی قائم ہوئی پردیپ نے کاجل کو اپنی مضبوط بانہوں میں بھر لیا۔ کچھ دیر تک دونوں محبّت بھری باتوں میں الجھے رہے۔ پھر یکا یک پردیپ خاموش ہو گیا۔ اور پھر اس کا ہاتھ کاجل کے مرمریں جسم سے پھسلتا ہوا ناف پر آ کر ٹھہر گیا۔

سر....سر....سر....

''نہیں پردیپ! تم ایسا نہیں کر سکتے۔'' کاجل نے اندھیرے میں پردیپ کا ہاتھ زور سے پکڑا اور ایک طرف جھٹک دیا۔

''مگر کیوں۔؟'' پردیپ کاجل کے اس رویئے پر بوکھلا اُٹھا تھا۔ ''پہلے اور اب میں بہت فرق ہے۔ اب میں تمہارا پتی ہوں۔'' پردیپ نے جھٹکے ہوئے ہاتھ کو سنبھال کر پھر سامنے کر لیا۔

''زبردستی کا دوسرا نام ریپ ہے مسٹر پردیپ! خواہ وہ اس کی بیوی ہی کیوں نہ ہو۔'' کاجل نے اس بار پردیپ کی مضبوط کلائی کو اتنی طاقت سے جکڑ لیا کہ اسے اپنی کلائی ٹوٹتی ہوئی معلوم ہوئی۔ اس وقت وہ بالکل بے بس نظر آ رہا تھا۔

پہلی رات جو خوشبوؤں میں لپٹی ارمانوں کی سیج کو مہکانے آئی تھی۔ ناکام سی لوٹ گئی۔

دونوں انا کی چادر اوڑھے نئی صبح کے منتظر تھے۔ دونوں کے سامنے ایک ہی سوال تھا۔ ''اب کیا ہوگا۔؟'' اور جواب بھی ایک تھا۔ '' ساتھ جی نہیں سکتے۔''

اندھی صبح کا دروازہ کھلتے ہی پردیپ سر جھکائے کمرے سے باہر نکل گیا۔ اور لڑکیاں مسکراتی اٹھلاتی وقت کی چادر پر رات کی سلوٹوں کا حساب کرنے اندر آ گئیں۔ چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ گھنٹوں جاری رہا۔ کاجل سب کچھ چپ چاپ سنتی رہی۔ کر بھی کیا سکتی تھی بے چاری سوائے جھنجھلانے کے۔ اور کبھی سوچا کرتی کہ اب اور اگر لڑکیوں نے اُلٹی سیدھی باتیں کی تو وہ اس کے منہ پر کہہ دے گی کہ جا کر پوچھ لے اپنے لاڈلے بھائی سے کہ اس نے میرے ساتھ کیا کرنے کی کوشش کی......لیکن اتنی ہمّت کہاں تھی۔ بدنامی کا ڈر بھی تھا۔ پھر دس منہ دس طرح کی باتیں۔ کس کس کے منہ کو روکتی۔؟ خاموش رہنے میں ہی اس نے عافیت جانی۔

پردیپ کے دوستوں کو بھی جیسے اس کے باہر نکلنے کا ہی انتظار تھا۔ سبھوں نے گھیر لیا۔ سب کا ایک ہی سوال تھا۔ ''تب کیسا رہا۔ کیسی لگیں میری بھابی جان؟'' ان رس بھرے سوالوں کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا کہ آخر وہ اپنے دوستوں کو کیا

بتائے۔ بہت دیر تک وہ جھوٹ اور سچ کے درمیان لٹکا رہا۔ آخر کار سوچ سمجھ کر اس نے فیصلہ کیا کہ اگر سچ کو کھلی کتاب کی طرح دوستوں کے سامنے رکھ دیتا ہے تو نہ جانے خوشیوں سے تھرکتے کتنے پاؤں یکا یک خاموش ہو جائیں گے۔ پھر لوگوں کا کیا ہے موقع ملتے ہی پان کی طرح لفظوں کو چبا چبا کر اس پر ہی تھوکیں گے کہ اس نے کاجل کو اپنا آئیڈیل بتایا تھا۔ گھر والے اگر شادی کے لئے راضی نہیں ہوتے تو وہ فوراً بغاوت پر اُتر آتا۔ اس لئے مجبوراً اسے جھوٹ کا سہارا لینا تھا۔

''اچھّی ہیں۔ اور سمجھو سب ٹھیک ٹھاک ہی رہا۔''

''نہیں، نہیں! اس سے کام نہیں چلے گا۔ سب کچھ کھول کھول کر بتاؤ۔''

''اچھّا بابا بتاؤں گا۔ مگر آج نہیں کل پیارے۔ طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

پردیپ کے چہرے کی بناوٹی مسکراہٹ پر کسی کی نہ گہری نظر پڑی اور نہ ہی کوئی بھانپ سکا۔ لیکن وہ تو بچپن کا آرٹسٹ تھا۔ اس لئے زندگی کے اسٹیج پر جب اسے آج جھوٹ کو سچ کرنے کا چانس ملا تو ایسی ایکٹنگ کی کہ وقت کا نبّاض بھی دھوکا کھا گیا۔

کاجل اور پردیپ الجھنوں کے بھنور میں اس طرح پھنسے ہوئے تھے کہ اس سے نکلنا بہت ہی مشکل تھا۔ اس لئے اپنی اپنی عزّت کی خاطر دونوں پرارتھنا پر پرارتھنا کر رہے تھے ''سورج ہمیشہ کے لئے آسمان میں ہی ٹھہر جائے۔'' لیکن ایسی پرارتھنا سے کیا حاصل؟ ہوتا وہی ہے جو ہونا ہوتا ہے۔ رات ہوتے ہی دونوں پر وحشت طاری ہوگئی تھی۔ اور جیسے جیسے رات کا پچھلا پہر بیت رہا تھا، ویسے ویسے دونوں ایک دوسرے کا سامنا کرتے ہوئے گھبرا رہے تھے۔

لیکن ہوا وہی جس کا ڈر تھا۔

پردیپ آج کی رات سر درد کا بہانہ بنا کر دوسرے کمرے میں سونے کا ناٹک کر رہا تھا۔ لیکن عورتیں بھلا کب ماننے والی تھیں۔ پکڑ کر دُلہن کے کمرے تک لے ہی آئیں اور ٹھٹھّا مارتے ہوئے بے چارے کو اندر دھکیل دیا اور باہر سے دروازہ بند کر دیا۔ اندر دھکیلنے میں بھابیوں نے اتنا زور لگایا تھا کہ اس کا پژمردہ جسم بے قابو ہو گیا اور وہ سیدھے دلہن کی

گود میں جا گرا۔ دلہن کی چوڑی ٹوٹ کر پردیپ کی پیشانی میں چبھ گئی۔ جب خون رسنے لگا تب کاجل کی پریشانی دیکھنے کے لائق تھی۔ وہ اپنے سرخ آنچل میں خون کو اس وقت تک جذب کرتی رہی جب تک خون کا رسنا بند نہیں ہوا۔

''درد تو بہت ہو رہا ہوگا۔؟'' کاجل سے رہا نہیں گیا۔

''ہاں! لیکن تمہاری محبت نے دوا کا کام کیا۔'' پردیپ نے اس ہاتھ کو چوم لیا جس سے لہو پوچھنے کا کام لیا گیا تھا۔

دوسری رات نے دونوں کی زندگی میں بہار کے سارے رنگ بھر دیئے تھے۔ اس رات وہ ایک دوسرے سے اس طرح گھل مل گئے جیسے کبھی کچھ بھی نہ ہوا ہو۔

راتیں آتی اور جاتی رہیں......

دن ہنستا مسکراتا اپنے گھر لوٹتا رہا.....

اس دن اور رات کے بیچ کاجل خوشیوں کی تلاش میں کہیں گم ہو کر رہ گئی تھی۔ پہلی رات کی تلخ کہانی کو اس نے بھلا کر پردیپ کو پوری طرح سے اپنا لیا تھا۔ اگر بھولے سے کبھی یادداشت کے پردے پر وہ کہانی بولنے لگتی تو وہ اپنے دونوں ہاتھ سے کان دبا کر اپنی آنکھیں بند کر لیتی۔ اس دن وہ پریشان پریشان سی رہتی۔ کچھ بھی اسے اچھا نہیں لگتا۔ پھر دوسرے کام سے خود کو جوڑ کر وہ اپنے آپ کو اس دلدوز کہانی سے دور لے جاتی۔ لیکن وہیں پردیپ اپنے ذہن سے پہلی رات کے اس منظر کو نوچ نہیں پایا تھا، اس لئے وہ اکثر خود سے الجھا رہتا۔ اپنے دوستوں سے اپنا اور بھابھیوں سے جب کاجل کا موازنہ کرتا تب وہ عجیب عجیب حرکتیں کیا کرتا۔ کبھی جوتے کا فیتہ سر سے کھینچ دیتا، تو کبھی روشن دان کی رسّی پکڑ کر جھول جاتا اور کبھی پردے کی ڈور پکڑ کر سڑاک سے کھینچ لیتا۔ ایسا کرنے میں اسے وہی راحت محسوس ہوتی جیسے تپتی دوپہر میں مسافت کی تھکن لئے ایک مسافر سایہ دار شجر کے نیچے آنے کے بعد محسوس کرتا ہے۔

دوسری رات سے اب تک کی تمام راتوں میں کاجل کی رضا شامل رہی تھی۔ یہاں تک کہ اب ہر کام میں پردیپ کاجل کی رضا چاہتا تھا۔ پردیپ کی انہی اداؤں پر جب

کاجل سوجان سے قربان ہوگئی تب اس نے فیصلے کے آگے خودکو جھکا دیا۔'' مردکو جس میں خوشی ملے عورت کو وہی قبول کرنا چاہئے۔''ایک دن اس سے رہا نہیں گیا۔

''آپ اس طرح سے ہر بات کیوں پوچھتے ہیں۔؟''

''تمہیں اچھّا نہیں لگتا ہے کیا۔؟''

''نہیں۔!''

''کیوں۔؟''

''اس لئے کہ تم مرد ہو۔اور مرد ہر بات پوچھا نہیں کرتے۔''

کاجل کی اس بات پر پردیپ کے اندر کا مرد باہر آجاتا ہے اور بھونڈی ہنسی ہنستا ہوا اپنی بتّیسی باہر نکال دیتا ہے۔

پردیپ کو ایک ایسی ہی رات کا انتظار تھا۔اس لئے وہ آج بہت خوش تھا۔لیکن پہلی رات کا عمل دہراتے وقت کاجل نے اس کے بڑھتے ہوئے ہاتھ پر ہاتھ رکھا اور آہستہ سے کان میں کہا۔''بس بس !اس سے اور آگے نہیں پیارے۔''تب پردیپ کو جھٹکا سا لگا اور اس کے اندر کا کریہہ صورت مرد باہر چلا آیا۔جو عورت کے آگے کے بارے میں سوچنے لگا۔سوچتے سوچتے اس نے سوئچ پر انگلی رکھ دی۔ٹیوب لائٹ جلتے ہی پردیپ نے اپنی چمکیلی آنکھوں کو سنبھالا ،لیکن اس سے پہلے کہ نظریں تسکین حاصل کرتیں۔کاجل سوئچ بورڈ کی طرف تیزی سے جھپٹ پڑی۔ٹیوب لائٹ آف ہوتے ہی پردیپ چیخ اُٹھا۔

''ابھی تو تم نے ہی کہا تھا کہ میں مرد ہوں اور مرد.....''پردیپ نے کلائی پکڑ کر اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

''لیکن یہ مت بھولو کہ میں ایک عورت ہوں۔''ایک ہی جھٹکے میں کاجل نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔''مرد کا جتنا حصّہ تھا میں نے تمہیں دے دیا ہے۔ایک عورت کا جتنا حصّہ ہے، بھگوان کے لئے میرے پاس ہی رہنے دو...''کاجل رو پڑی تھی۔رات بھر روتی رہی اور پردیپ اپنی ہی انا کی آگ میں سلگتا رہا کہ آج بھی وہ جیت نہیں پایا۔

اِدھر کچھ دنوں سے پردیپ رات گئے گھر لوٹا کرتا۔رمیش اس کے دوستوں میں

سے تھا۔آج کل اس سے خوب پٹتی تھی۔شہر کے مین چوراہے پر اس نے ویڈیو ہال کھول رکھا تھا۔جہاں دن میں کمرشیل فلمیں دکھائی جاتیں اور رات ہوتے ہی وہاں ننگی چلتی پھرتی تصویروں کی دکان خودبخود سج جایا کرتی۔یہاں سے گھر لوٹتے وقت پردیپ کی آنکھوں کے سامنے روشنی میں دودھ سا چمچماتا ہوا عورت کا بدن ہوتا اور خط اور دائرے کے بیچ پھسلتی اور رکی ہوئی اس کی بے چین آنکھیں ہوتیں۔پردیپ اپنی تسکین کے لئے کاجل کو بھی اس روپ میں دیکھنا چاہتا تھا۔لیکن کیا وہ اسے اب دیکھ پائے گا؟اس سوال کے ابھرتے ہی اس کے ذہن میں ہلچل برپا ہو جایا کرتی۔

اس طرح سال کا پہیہ ایک چکر کاٹ کر کچھ دیر کے لئے اپنی جگہ پہنچ گیا تھا۔اس شام گھر سے نکلتے وقت کاجل نے کہا تھا۔''دیکھو جی!آج ہماری شادی کی پہلی سالگرہ ہے۔جلدی لوٹ آنا۔''

اس رات بھی پردیپ رمیش کے ویڈیو ہال سے لوٹ رہا تھا۔رات گہری ہو چکی تھی۔قدم بہک رہے تھے۔وہ پیتا نہیں تھا۔لیکن پتہ نہیں آج دوستوں کے بہکاوے میں وہ کیسے آ گیا۔راستہ بھر فلم کا وہ منظر جو آنکھوں کے اسکرین پر چسپاں ہو گیا تھا،اس کے سامنے گھومتا رہا۔اسے مدہوش پر مدہوش کرتا رہا۔مدہوشی کی لذّت سے جب وہ سرشار ہو گیا تب اس نے اس فلم کے ہیرو کی طرح یہ فیصلہ کیا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے لیکن وہ آج کاجل کی مشرقیت کو تارتار کر کے مغربیت کی روشنی سے نہلا دے گا۔اگر وہ زور آزمائی پر اُتری تو سالی کے منہ اندھیرے میکے کا ٹکٹ پکڑا کر گیارہ نمبر کی گاڑی سے چلتا کر دے گا۔

آج انتقام کی آگ اس کی روح تک پہنچ چکی تھی۔

پردیپ نے گھر کے برآمدے پر جیسے ہی قدم رکھا،اندر آہٹ ہوئی اور دروازہ کھل گیا۔کاجل سراپا انتظار اس کے سامنے تھی۔''شادی کی پہلی سالگرہ مبارک ہو کاجل جی!'' اور پھر اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کی مدہوش بھری آنکھوں کی گولیاں ناچنے لگیں۔کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے اتنی جلدی میں کپڑے اتارے جیسے کسی بھوکے نے ایک ہی بار میں کیلے کے چھلکے اُتار دیئے ہوں۔کاجل کھانا نکالنے کے لئے باورچی

خانے کی طرف جانے لگی تو پردیپ نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے اوپر گرا لیا۔ آج اس کی یہ حرکت کاجل کو بُری نہیں لگی تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ پردیپ کے بدلے ہوئے رویئے اور پینے کی طرف اس کا ذہن نہیں گیا۔ ہاں! پان کی خوشبو اسے آج اچھّی لگ رہی تھی۔ اس لئے اس نے بھی نزاکت کا سہارا لیا۔

''چھوڑو بھی مجھے کھانا نکالنا ہے۔''

آج پردیپ کو کھانے کا ذائقہ کچھ اور ہی لطف دے رہا تھا۔ ویسے تو ہر روز کی طرح کاجل سامنے بیٹھی تھی۔ گندم کی اجلی روٹی کو جب وہ دانتوں کے درمیان دباتا تو اس کی نس نس میں سرور و مستی چھا جاتی۔ اس وقت وہ کاجل کو ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے وہ ویڈیو ہال میں ہو اور کاجل اسکرین پر ہیروئن کی طرح مادر زاد پڑی ہو۔

''اس طرح پھٹی پھٹی آنکھوں سے کیا گھور رہے ہو۔؟'' کاجل یوں ہی مسکرانے لگی تھی۔ ''کوئی خاص بات ہے کیا جناب؟''

''ہاں بس ایسا ہی سمجھو۔'' پردیپ نے ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑنا چاہا۔

''چھوڑو بھی مجھے نیند آ رہی ہے۔'' کاجل نے شرارت بھرے انداز میں اس کے گالوں کو چیونٹی کا مزہ دیا۔

''نیند تو مجھے بھی آ رہی ہے۔'' پردیپ نے گنجی اتار کر سینے کے الجھے بالوں پر انگلیوں سے جب کنگھی کا کام لیا تو خود کو ایک عجیب لذّت سے دوچار پایا۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر کاجل کو پکڑ لیا۔ آج کاجل نے وہی سرخ جوڑا پہن رکھا تھا جس جوڑے میں پردیپ نے اسے سہاگ کی پہلی رات دیکھا تھا۔ بناؤ سنگھار سب کچھ پہلی رات کی طرح ہی تھا۔ اس لئے اس کے انگ انگ میں آج شرارت دوڑ رہی تھی۔ اس نے پردیپ کے سر پر ایک ہاتھ رکھ کر اسے ذرا نیچے جھکائی اور ایڑیوں کے سہارے اچک کر اس کے گرم گرم ہونٹوں پر اپنی بندیا رکھی۔ پہلے مسکرائی اور پھر چہک کر بولی۔

''اب اگر میرے نام کی طرح یہ کمرہ بھی کاجل میں بدل جائے تب تمہیں ڈر تو نہیں لگے گا۔؟''

''نہیں میری جان۔!''

پردیپ کا ''نہیں'' کہنا تھا کہ کاجل نے سوئچ پر انگلی رکھ دی۔

کمرے میں ایک بار پھر اندھیرے کی سلطنت قائم ہو گئی تھی۔ مدہوشی کے اسی رنگ میں پردیپ نے کاجل کو پکڑنا چاہا۔لیکن اس سے پہلے کہ وہ ایسا کر پاتا، کاجل نے پیچھے سے اسے ہی اپنی مضبوط بانہوں میں جکڑ لیا۔ایسا کاجل نے پہلی بار کیا تھا۔لیکن اس وقت پردیپ انا کی بنیادوں پر کھڑی عمارت کے اوپر انتقام کی چھت کے نیچے اپنی مردانگی کی آگ میں جھلس رہا تھا۔وہ آج کی اس سہانی دلگداز رات کی ڈور کو کسی بھی قیمت پر اپنے ہاتھوں سے نکلنے نہیں دینا چاہتا تھا۔آنکھوں کے کینوس پر سہاگ رات کے دلدوز مناظر رقص کر رہے تھے اور دوسری طرف اسکرین پر دودھ میں نہائی بے لباس دوشیزہ زندگی کا رس نچوڑ رہی تھی۔اس وقت اس کے اندر کا ہمزاد اندھیرے میں روشنی کا پھن کاڑھے چھپا بیٹھا تھا کہ موقع ملتے ہی وہ کاجل کے اوپر سے چادر کھینچ کر سوئچ آن کر دے گا۔

تھوڑی ہی دیر بعد پردیپ کو جیسے ہی لگا کہ وہ سنہری موقع اس کے ہاتھ آ گیا ہے تو اس کے ہاتھوں میں سختی آنے لگی تھی۔کاجل اس بات کو بھانپ گئی۔اس نے چادر کے ایک کونے کو مضبوطی سے جکڑ لیا۔ ٹھیک اسی وقت پردیپ نے چادر کے ایک سرے کو پکڑا اور.....اور اس سے پہلے کہ وہ کھینچتا، کاجل نے پوری طاقت سے چادر کھینچ لی۔اور لائٹ آن کر دی۔

''ارے،ارے! پاگل ہو گئی ہو کیا۔؟''

''آج پردیپ، کاجل کی اس حرکت پر بُری طرح سے بوکھلا گیا تھا۔اس لئے چہرے کا رنگ یکا یک بے رنگ ہو گیا۔پھر وہ چادر کی طرف تیزی سے جھپٹا اور خود کو روشنی سے بچاتے ہوئے سوئچ بورڈ کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

روبہ زوال

نئی نسلی پرانی نسلی کر نکل رہی تھی.......

صدیوں کا سفر، صدیوں کی اور سفر کر رہا تھا کہ جُڑواں بچے کی پہلی آمد نے تاریخِ آدم میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ ایک بچے کی ایک آنکھ نہیں تھی تو دوسرے کا ایک پیر کمر سے ہی الگ۔

زمین و آسمان حیراں

ذرہ ذرہ پریشاں

دونوں بچوں پہ جس شخص کی پہلی نظر پڑی تھی وہ دیکھتے ہی ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔ اور پاس کا ہجوم بھی آہستہ آہستہ منتشر ہو گیا تھا۔ لوگ بچے کی پرچھائیں سے اس لئے خوف زدہ تھے کہ اگر اس کی پرچھائیں اس عورت پر پڑ گئی جو خود کو قید کئے بیٹھی ہے تو وہ بھی ویسے ہی بچے جنمے گی۔

اندھے......!

لنگڑے......!!

''ان بچوں کی وجہ سے سارے گاؤں

میں افرتفری مچی ہوئی تھی۔ جتنے لوگ اتنی باتیں۔

''یہ بچے اپنے ہمراہ مصیبتوں کا سمندر لے کر اس دھرتی پر وارد ہوئے ہیں۔ اس گاؤں کو مصیبتوں سے نجات دلانے کے لئے دونوں بچوں کو زندہ دفن کرنا ضروری ہے۔''

سفید بال والے شخص نے بھیڑ کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''اگر ایسا کرنے پر اُن کے ماں باپ راضی نہیں ہوئے تو.......؟''

''یہ سارے گاؤں کا معاملہ ہے۔ اس لئے ہم سب مل کر ان کے گھر والوں پر دباؤ ڈالیں گے۔''

''چلو بھائیو! چلو۔ چلو۔''

بھیڑ بچے کے گھر کو گھیرے ہوئے تھی۔ ماں باپ پر دباؤ ڈالا جا رہا تھا۔ پہلے تو دونوں میں سے کوئی بھی تیار نہیں ہوئے۔ لیکن جب بار بار گاؤں کو مصیبتوں سے بچانے کی دُہائی دی گئی تو باپ جیسے تیسے کر کے مان گیا۔ لیکن وہ ماں جو نو ماہ تک اپنی کوکھ کا درد برداشت کرتی رہی تھی۔ سسک پڑی۔ سسکتی رہی۔

وقت کب کیسے گُزرا کسی کو پتہ نہیں چلا۔ اور جب پتا چلا تو اس وقت تک گاؤں والوں کو دونوں بچوں سے کچھ نہ کچھ اُنسیت ہو ہی گئی تھی۔ وقت کے پیچھے پیچھے دونوں دوڑتے رہے.......

دوڑتے دوڑتے چار ہو گئے۔

اندھے

لنگڑے

گونگے

اور بہرے.......

پھر چاروں دنیا کی چار سمت پھیل گئے۔

پورب

پچھم

اُتّر

اور دکھن........

اب صدیوں کا سفر صدیوں کی اور سفر کرتے کرتے کچھ تھم سا گیا تھا۔

نئ نسل......!

کسی کی ایک آنکھ نہیں تھی تو کوئی دونوں ٹانگوں سے معذور۔ کسی کے دونوں پاؤں سلامت تھے تو کوئی سُن اور بول نہیں سکتا تھا، اور کسی کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔

ہاتھ نہ پاؤں.......

آنکھ نہ ناک........

سر نہ دھڑ.......

اور جب ایسا ہوا تب سفید پوش شخص کی باتیں لوگوں کے ذہن میں ہتھوڑے برسا نے لگیں۔ اور تب لوگ مضطرب و پریشان عیبوں کی پوٹلی لئے نجات کا ذریعہ ڈھونڈ نے لگے۔ ان کی پریشانی کا یہ عالم تھا کہ لوگ ڈاکٹر اور حکیم کا گھر تک بھول گئے تھے۔ بالآخر بھول کے اس سلسلے کو ایک عقلمند نے ختم کیا۔

جب گاؤں والے اپنی اپنی عیبوں کی پوٹلی لئے ڈاکٹر اور حکیم کے گھر پہنچے تو لوگوں کے سر سے آسمان سرک گیا تھا۔ اس لئے کہ ڈاکٹر کے چشمے کا ایک گلاس سیاہ تھا اور حکیم بیساکھی کے سہارے چل رہا تھا۔

دروازے ایک کے بعد ایک کھٹکھٹائے جاتے رہے۔

اور سارے دروازے اسی طرح سے کُھلتے اور بند ہوتے رہے۔ مگر سب بے سود۔ نجات کا یہ مسئلہ جب آہستہ آہستہ کافی گمبھیر ہو گیا تو اس سے چھٹکارا پانے کے لئے گاؤں والے ایک دن ایک جگہ جمع ہوئے۔ جہاں سب کو کھلے عام رائے دینے کی اجازت تھی۔

''آج لولے، لنگڑے، بہرے، اندھے اور کانے بچے کثیر تعداد میں پیدا کیوں ہو رہے ہیں۔ ہزاروں سال قبل تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔ کیوں نہ ہم آج ہی نس بندی کروالیں۔

پھر نہ ہی ہماری پاک دھرتی پر ایسے بچوں کے پاؤں پڑیں گے اور نہ ہی کبھی ہماری آنے والی نسل کو مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

مُکھیا کی ان باتوں پر گاؤں والے ردوکد پر اُتر آئے۔

''نہیں یہ بھگوان کی دین ہے۔''

ہمارے مذہب میں ایسے بچوں کا قتل جرم ہے۔''

اس طرح ہماری نسل دم توڑ دے گی اور ہم بے منزل، بے نشان اور بے سمت ہو کر رہ جائیں گے۔''

ایک رات.......

گاؤں کے ایک شخص نے خواب میں ایک ایسے دیوقامت شخص کو دیکھا جس کے ناخن سے لے کر، بال، چمڑے اور کپڑے بھی سفید تھے۔ وہ اُسے جھنجوڑ کر کہہ رہا تھا۔

''یہ لولے لنگڑے، بہرے، اندھے اور کانے بچے جو تمہاری اپنی نسل ہیں، جو ان ہو کر جب تمہیں نگل رہے ہیں تو تم اِن سے نجات کا ذریعہ ڈھونڈ رہے ہو۔ اب تمہیں ان اپاہج بچوں سے کبھی نجات نہیں مل سکتی ہے۔''

''کیا نجات کے لئے سارے راستے بند ہو چکے ہیں......؟'' اس شخص کی آنکھوں میں آنسو اُتر آیا۔

''کیا زندگی بھر ہمارے بچے ہمارے لئے عذاب بنے رہیں گے۔''

''ہاں! اب تم سب چاہ کر بھی عذاب کے حصار سے باہر نہیں نکل سکتے۔

''نہیں، نہیں.......ایسا مت کہئے........؟'' وہ شخص پاؤں پکڑ کر گڑ گڑانے لگا تھا۔ ''ہمیں ہر حال میں اس سے نجات چاہیے۔''

''اچھا تو پھر وعدہ کرو.......''

''ہاں! میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب کبھی ہماری نسل میں ایسے بچے پیدا نہیں ہوں گے، اور اگر غلطی سے ہو بھی گئے تو ہم اُسے زندہ رہنے نہیں دیں گے۔

اِدھر سورج نکلا اور اُدھر بات روشنی کی طرح سارے گاؤں میں پھیل گئی۔ لوگ بھو

کے پیاسے دیو قامت شخص کی تلاش میں نکل پڑے۔ گلی، کوچے، میدان، پہاڑ اور پٹھار جہاں تک ممکن ہوسکا ڈھونڈتے رہے۔ لیکن آخر کار ڈھونڈتے ڈھونڈتے جب تھک گئے تو مایوسی کی چادر اوڑھے اپنے اپنے کو لوٹ گئے۔

دن میں مزدوری کر کے شام کو جب تھکے ہارے گھر لوٹتے تو سارے لوگ کہیں نہ کہیں جمع ہوجاتے۔ اور اس شب بھی سارے لوگ ایک وسیع میدان میں جمع ہوئے تھے۔ اُس شب بھی وہی ساری باتیں دہرائی جا رہی تھیں۔ اور اس شب بھی لوگ وہی سن رہے تھے کہ یکا یک دیو قامت شخص جس کے ناخن سے لے کر بال اور چمڑے سے لے کر کپڑے تک سفید تھے، ہجوم کے بیچ نمودار ہوئے۔ جس کے دائیں ہاتھ میں مشعل تھی........دیکھتے ہی لوگوں کے اوسان خطا ہوگئے تھے۔ لیکن وہ شخص جس نے اُنہیں خواب میں دیکھا تھا، فوراً اُن کے پاؤں پر گر پڑے۔ لوگ گرتے رہے اور آنسوؤں سے اُن کے پاؤں دھوتے رہے۔ گڑگڑاتے رہے۔

''ہمیں نجات چاہئے۔ ہمیں نجات دلائیے.......''

دیو قامت شخص نے اپنا دایاں ہاتھ فضا میں لہرایا۔ مشعل کی لَو بھڑک اُٹھی۔ لوگوں کے سامنے رکھ کر پوچھا۔

''تمہیں ان شعلوں کے درمیان کچھ نظر آ رہا ہے.......؟''

سب نے عالم تذبذب میں اپنی اپنی آنکھیں شعلوں میں ڈال دیں۔ ساری آنکھیں کچھ پانے کی تمنا میں جھلستی رہیں.......کئی ایک آنکھیں جب لوگوں نے گنوا دیں تو گڑگڑانیکے علاوہ اُن کے پاس اب بچا کیا تھا۔

''اے عالم ورہبر! ان شعلوں میں ایک وسیع پہاڑ، کھائی، کھائی کے سینے سے گزرتا ہوا خاردار جھاڑیوں اور لمبے لمبے نوکیلے کانٹوں کا ایک پراسرار راستہ.......اور پہاڑ کی چوٹی پر ایک فقیر بیٹھا ہوا نظر آ رہا ہے۔''

اگر تمہیں ان مصیبتوں سے نجات چاہئے تو تم سب کل اس پہاڑ پر سورج کے طلوع ہونے سے قبل پہنچ جاؤ۔ تمہاری ساری مصیبتیں وہاں پہنچتے ہی ختم ہو جائیں گی۔'' دیو

قامت شخص اتنا لکھ کر کہیں روپوش ہو گیا۔
لوگوں کے چہرے خوشیوں کی لالی سے بھیگ گئے.......
رات کے جنم لیتے ہی لوگ اپنی اپنی عیبوں کی پوٹلی لئے پہاڑ کی ترائی میں جمع ہونے لگے۔لوگوں کے ہاتھوں میں مشعلیں تھیں۔
پہاڑ کے پاس کھائی کے قریب پہنچ کر لوگ رُک گئے۔کیوں کہ آگے بڑھنے کی کوئی سبیل نظر نہیں آ رہی تھی۔ایک سبیل تھی جو کھائی کے درمیان تھی۔جس کے وجود سے لمبی لمبی خار دار جھاڑیوں اور لمبے لمبے نوکیلے کانٹے سر نکالے ہوئے تھے۔لمبی لمبی خار دار جھاڑیوں اور لمبے لمبے نوکیلے کانٹوں سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے لوگ دوسری سبیل کی تلاش میں اِدھر اُدھر پاگلوں کی طرح دوڑ رہے تھے۔وقت کا بہاؤ تیز سے تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔
اِدھر سورج اپنی آنکھیں مل رہا تھا۔اور اُدھر ایک آواز گونج رہی تھی۔'' جلدی آؤ'' جس کی لپیٹ میں سارا شہر چلا آیا تھا۔لوگوں کی خوفزدہ نظریں پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھے ہوئے فقیر پر صاف پڑ رہی تھیں۔لوگ اب دوسری سبیل کی تلاش کرتے کرتے تھک گئے تھے۔
لیکن تلاش کا یہ سفر جاری تھا.......
لوگ اب بھی دوڑ رہے تھے۔گر رہے تھے۔پھر دوڑ رہے تھے۔اس آس میں کہ کوئی دوسری سبیل نجات کا ذریعہ بن جائے اور ان کا وجود چھلنی ہونے سے بچ جائے۔
سورج بستر چھوڑ چکا تھا۔لیکن اس کی پلکیں نیند کے خمار سے اب بھی بوجھل تھیں۔
وہی آوازیں ایک بار پھر پہاڑوں کے سینے میں اُتر گئیں۔پہاڑ لرز کر رہ گیا۔
''جلدی آؤ.......جلدی! ورنہ وقت تمہارے ہاتھوں سے نکل جائے گا اور تم.......تم اسی طرح سسکتے اور تڑپتے رہ جاؤ گے۔''
فقیر کے ہاتھ اس سمت اُٹھے ہوئے تھے جہاں ہلکی ہلکی سرخیاں تیر رہی تھیں۔
اندھیرا آہستہ آہستہ چھٹنے لگا تھا اور ہلکی ہلکی روشنی پھیلنے لگی تھی۔جلد سے جلد چوٹی پر پہنچنے کی خواہش میں لوگ جانے انجانے میں اپنی اپنی مشعلیں کھائیں میں پھینک دیں۔

کھائی سرخ سمندر میں تبدیل ہوگئی۔

سورج کے خوف سے لوگ خار دار جھاڑیوں اور لمبے لمبے نو کیلے کانٹوں کی سبیل پر اپنے اپنے وجود کو کھینچتے رہے کہ کہیں سورج نکل گیا تو پھر پوری زندگی عذابوں تلے دب کر جینا ہوگا۔

کھائی میں کسی چیز کے گرنے کی آواز رُک رُک کر مگر مسلسل آ رہی تھی۔ فضاؤں میں جلے ہوئے گوشت کی بو رچی بسی ہوئی تھی۔ آسمان دھواں دھواں تھا۔

''کہانی ختم ہوگئی.......'' راوی نے کہا۔

رات کافی گہری ہو چکی تھی۔ سارے لوگ اپنے اپنے گھر جانے کے لئے جیسے ہی کھڑے ہوئے راوی نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''بھائیو! کہانی ختم تو ہوگئی۔ لیکن کہانی اب بھی جاری ہے۔''

لوگ دائرے میں سمٹ کر بیٹھ گئے تو راوی نے کہانی جاری رکھی.......

''وقت کے پر لمبے ہوئے تو میں بھی جواں ہو گیا۔ اور جب صدیوں بعد اپنی بند آنکھیں کھولیں تو میری چیخ نکل گئی کہ میرے چاروں بچے ....اندھے، لنگڑے، گونگے اور بہرے ہیں۔'' یہ کہتے کہتے راوی کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ بھیگی آنکھوں سے اُس نے لوگوں کو غور سے دیکھا اُن کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ راوی نے رک رک آواز میں سوال کیا۔

''کیا نئی نسل ایک بار پھر پرانی نسل کر نگل رہی ہے۔؟''

اور صدیوں کا سفر صدیوں کی طرف سفر کرتے کرتے تھک گیا ہے۔''

راوی کے اس سوال پر سب خاموش تھے۔

☆☆☆

نسل کشی

''......اور ان عورتوں کے ساتھ جو ہم میں سے نہیں ہیں، تب تک بلاتکار کرو جب تک کہ وہ سب کی سب پرگنینٹ نہ ہوجائیں۔''

نئی اور پرانی قوموں کے درمیان صدیوں کی یہ جنگ، صدیوں سے اسی طرح جاری ہے.......

اور اِدھر نئی قوم کے اثر ورسوخ کو عالمی سطح پر پھیلتے ہوئے پرانی قوم نے دیکھا تو ان سے یہ مقبولیت دیکھی نہیں گئی اور خود بخود احساسِ کمتری کا شکار ہوتی چلی گئی، کہ اگر اب ہم میں سے کچھ اور لوگوں کی حمایت نئی قوم کو حاصل ہوگئی، یا پھر چھوٹی چھوٹی قوموں کی نظریں اُدھر اُٹھ گئیں تو دنیا کے نقشے پر ہماری قوم کا کیا حشر ہوگا؟ اقلیت، اکثریت میں تبدیل کر ہمیں آنکھیں دکھائے گی۔تب کون پوچھے گا ہمیں؟ اور کہیں ہمارا وجود ہی مٹ گیا تو اِس کا ذمہ دار کون ہوگا......؟

ایسے اور اس طرح کے بہت سارے سوالوں نے مل کر جب اُنہیں بُری طرح جھنجھوڑ دیا تب وہ سب اپنی قوم کی حفاظت کے لئے اپنے ہاتھوں میں ہتھیار لئے نئی قوم کی سرحدوں پر تعینات فوجی لشکروں کے

سینوں کو گولیوں سے چھلنی کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے.......

سالہا سال یہ جنگ جاری رہی.......

دونوں طرف سے لاکھوں جانیں تلف ہوئیں۔

لیکن اس جنگ میں جیت اُس کی ہوئی، جس کے پاس طاقت تھی. ۔جس کے پیچھے سُپر پاور تھی۔ نئ قوم جب چاروں خانے چت ہوگئی، تب ایسے مرد مجاہد اپنی قوم کی حفاظت میں پیش پیش تھے۔ اُن کے گھروں پر شب خون مارا گیا۔ مردوں کو قید میں ڈالا گیا۔ قطار میں کھڑا کر کے ہزاروں ہزار مردوں کو گولیوں سے بھون ڈالا گیا۔ راہِ فرار کی کوشش میں لوگ سرحدوں پر مارے گئے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کو بھی ریگزاروں میں گھسیٹا گیا۔ پل کے بیچوں بیچ لوگوں کو کھڑا کر کے دونوں طرف سے تیز رفتار گھوڑے دوڑائے گئے۔ بسوں کے ذریعے بھاگتے ہوئے لوگوں پر لانچر سے کہیں راکٹ برسائے گئے تو کہیں پناہ گزینوں کے کیمپوں میں بھاری بمباری کر کے اُنہیں تہس نہس کیا گیا۔

میجر جنرل کے ہونٹوں پہ خوشی محوِ رقص تھیں.......

''ہم نے اپنے پلان کے مطابق سارے مردوں کو خاک میں سلا دیا ہے. اس لئے آج ہم سب خوشیاں منائیں گے.......ناچیں گے........گائیں گے........اور....... اور اُن کی ایک ایک عورتوں کے ساتھ اُس وقت تک عصمت دری کریں گے جب تک کہ وہ سب کی سب پرگنینٹ نہ ہوجائیں۔ لیکن یاد رکھو کہ یہ بھی ہماری جنگ کا ہی ایک لازمی حصہ ہے۔''

میجر کی باتوں پر زیادہ تر فوجیوں کے چہرے اُس وقت خوشیوں سے دمک اٹھے۔ اپنی سرحدوں سے نکلے اور عورتوں کو چھوئے اُنہیں ایک زمانہ ہوگیا تھا۔ میجر کی بات ختم ہوتے ہی کچھ شراب کی بوتلیں کھولنے لگے۔ کچھ جھومنے لگے۔ کچھ وحشیانہ آوازیں نکالنے لگے.......اور پھر موج مستی کے اُس ندی میں ایک ایک کر کے سبھی تیرنے لگے۔

عورتیں روتی رہیں.......

لیکن آج اُن کی چیخ و پکار اور فریاد سننے والا کوئی نہ تھا۔

گھر گھر ننگا ناچ جاری تھا.......

میجر جنرل اس سُہانے منظر کو اپنی آنکھوں کے کیمرے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قید کرنا چاہتا تھا۔اس لیے وہ گھروں گھر نکل پڑا.........دروازہ کھلوانے کی ضرورت اس لئے بھی نہیں تھی کہ وہاں ہر گھر آج کے لئے بغیر دروازے کا ہو کر رہ گیا تھا۔فوجیوں کو جہاں اور جس حال میں عورتیں مل گئی تھیں، وہیں دَھر دبوچا تھا۔لیکن ایک گھر کا دروازہ اندر سے بند تھا. دروازہ کھلوانے کے بعد میجر نے بغور دیکھا۔عورت پوری طرح کپڑے میں تھی۔ نوجوان کی وردی بھی پسینے سے تر نہیں تھی۔ بال بھی سلجھے ہوئے تھے اور چادر کی سلوٹیں بھی ٹوٹی نہیں تھیں۔

''حرام خور!'' میجر نے غضبناک نگاہوں سے فوجی کو دیکھا اور ایک بھرپور طمانچہ لگا دیا۔ پھر اس عورت کی طرف ڈھکیلتے ہوئے کہا۔

''لے.......چل........جلدی کر.......''

وہ اُسی طرح سر جھکائے کھڑا رہا۔

''سالے کھولتا ہے یا میں........؟''

اس بار نوجوان نے ڈرتے ڈرتے نظریں اُوپر کیں۔

''سر! اِن عورتوں کا قصور صرف اتنا ہے نا، کہ یہ ہماری عورتوں میں سے نہیں ....؟''

''سالے ہمدردی جتلاتا ہے؟''

میجر نے لاتوں سے اس کا بھرپور استقبال کیا۔ پھر مِنّت سماجت کرتی عورت کے سارے کپڑے اُتار کر نوجوان کی طرف ڈھکیلتے ہوئے چلّایا۔

''چل۔ یہ آخری موقع ہے تیرے پاس.......''

''اگر ہماری عورتوں کے ساتھ ایسا ہوا ہوتا تو آپ کو کیسا لگتا؟'' ہونٹوں سے بہتے ہوئے خون کو ایک ہاتھ سے صاف کرتے ہوئے فوجی نے تیکھی نظروں سے میجر کو دیکھا۔

میجر نے فوجی کی اس توہین آمیز بات پر پہلے چیخ چیخ کر آس پاس کے گھروں

میں طاقت آزمائی کر رہے نوجوانوں کو بلایا اور پھر اس باغی فوجی کی جم کر دُھنائی کر دی۔

''سالے یہ کیا تیری بہن ہے؟''

''تیری کوئی بہن ہے کیا؟''

''کمینے تیری یہ ہمت......؟''

پھر میجر نے اس نوجوان کے ساتھ پہلے اپنے اور بعد میں فوجیوں کے ذریعہ وہی گھناؤنا دہرایا، جونئ قوم کی عورتوں کے ساتھ گھر گھر جاری تھا۔ سانس کے رُکتے ہی اُسے اُسی گھر کے پنکھے میں بنا عضوِ خاص کے ننگا لٹکا دیا گیا۔

اس کے بعد سارے فوجی اور بھی مستعدی کے ساتھ اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔

کچھ عورتوں نے دورانِ فعل دم توڑ دیا۔ کچھ ساہسی عورتوں نے دم توڑنے کے لئے خود کو مجبور کیا۔ موقع ملتے ہی چھت سے کود گئیں۔ کنویں میں ڈوب گئیں۔ زہر کھا لیا۔ کچھ چاہ کر بھی ایسا نہیں کر پائیں کہ اُن کے اُوپر فوجی سائے کی طرح چھائے ہوئے تھے۔ ہڈیاں نوچ رہے تھے.......اور کچھ نے رونے پیٹنے اور چیخنے چلانے سے بہتر خود کو سپرد کر کے اپنی جان بچانے میں ہی بھلائی جانا۔

مہینوں یہ عمل گھر بدل بدل کر فوجیوں کی طرف سے جاری رہا۔

پھر وہ وقت آ ہی گیا......بہت ساری عورتیں پرگننیٹ ہو گئیں۔ میجر فوجی ڈاکٹروں کے ساتھ گھر گھر گھوم کر عورتوں کے پیٹ کو چھو چھو کر اُس وقت تک دیکھتا جب تک کہ اُسے پوری طرح یقین نہ ہو جاتا کہ اُس کی کوکھ میں حرام کا پلاّ پل رہا ہے یا نہیں......؟ اس کے بعد ہی دوسرے گھر کی طرف قدم اُٹھاتا۔ معائنے کا کام جب مکمل ہو گیا تو ایک بار پھر اُن کے چہروں پر فاتحانہ شیطانی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''اس طرح اب نئی نسل دوغلی ہو جائے گی۔''

''نسل کشی کر کے ہم نے اس نسل کا سرے سے خاتمہ کر دیا ہے۔''

''اب کوئی دوسری قوم ہماری قوم کو کبھی بھی کسی مقام پر چیلنج دینے کو کوشش نہیں

کرے گی، اور اگر کرے گی تو اُس کا حشر بھی کچھ ایسا ہی ہوگا......اور پھر وہ سب کے سب خوشیوں بھرے راستوں پر قہقہے بکھیرتے ہوئے نسل کشی کی اپنی اس شیطانی مہم کو مکمل کر کے اپنی سرحدوں کی اور لوٹ گئے۔

اور نئی نسل کی سرحدوں میں وہی عورتیں جو روندی، کچلی، مجبور اور بے بس تھیں، آنسو بہانے کے لئے باقی رہ گئیں۔انہی آنسوؤں کی گہری چھاؤں میں وہ تمام فوجیوں کے گھناؤنے فعل کے زہر کو اپنے اندر گھلتے ہوئے دیکھتی رہیں اور پھولتی رہیں......

ایسے وقت میں ہر عورت دوسری عورت سے آنکھیں چار کرنا نہیں چاہتی تھی ۔لیکن جب غم ایک تھا تو مل کر بانٹنا ہی تھا۔اس غم کو کچھ کم کرنے کے لئے وقت سے پہلے ہی کچھ ایک عورتوں نے شیطان کی اولادوں کا گلا گھونٹ دینا چاہا تھا۔کچھ ساہسی عورتوں نے پہل بھی کی۔

اس دوران عورتوں کے ایک خصوصی تنظیم کا وجود عمل میں آیا۔جس نے ایسا کرنے سے عورتوں کو روکا کہ ''اب اُن کی اولادیں ہی ہماری جنگ کے کارگر ہتھیار ہیں۔''

پھر ایک ایک کر کے ساری عورتوں نے اپنے آنسوؤں کو اپنی آنکھوں میں ہی روک لیا۔

دائرہ پھیلتا رہا........

اور ایک دن وقت کے پالنے میں بہُت سارے بچے جھولنے لگے۔

اور پھر ان بچوں پر نظریں پڑتے ہی ماؤں کے چہرے پر انوکھی مسکراہٹ پھیلنے لگی تھی کہ وہ سب تو جنگ کے ہتھیار ہیں۔اس لئے ان کی دیکھ بھال کچھ اس طرح کر رہی تھیں کہ اس لوہے میں زنگ لگنے کا سوال ہی نہیں اُٹھتا تھا۔

ہتھیار دو قسم کے تھے۔لڑکا اور لڑکی۔لڑکوں کے نام ان عورتوں نے اپنے شہید مردوں کے نام پر رکھے اور لڑکیوں کے نام پرانی قوم کی بیٹیوں کے ہمنام رکھ دیئے۔اس طرح ایک قوم دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔جس کے یہاں لڑکے نے جنم لیا تھا وہ نئی نسل کے پیروکار رہے۔لیکن جس گھر میں لڑکی کے پاؤں پڑے تھے، پرانی قوم کو اپنانے کی وجہ سے

وہاں سب کچھ تبدیل ہوکر رہ گیا تھا۔رہن، سہن، کپڑے، مذہب، زبان طرف اور........
اور بہت کچھ.......اور کچھ ویسا ہی اپنالیا گیا تھا۔

لوگ ہتھیار چھپا کر رکھتے ہیں۔لیکن ماؤں نے اپنی بیٹیوں کو کھلی فضا میں پرواز کرنے کے لئے بالکل آزاد چھوڑ دیا تھا۔فیشن ان لڑکیوں کے پیرو سے جب ایک بار شروع ہوتا تو سر پر ہی جا کر ختم ہوتا تھا۔ مائیں اپنی بیٹیوں کو اپنے ذریعے بنائی گئی عبادت گاہوں میں لے جایا کرتیں۔لڑکیوں کے ہوش سنبھالنے سے قبل، کتابوں سے انہوں نے جو کچھ سیکھا تھا، بڑا ہونے پر اس کی روشنی میں انہیں مذہب کی تعلیم دیتیں۔لڑکیوں کے روبرو کبھی نئی قوم کا ذکر نہ کرتیں۔

لڑکیاں عمر کی سیڑھیاں تیز رفتاری سے چڑھتی رہیں.......
لڑکوں کے قدم بھی اُسی تیز رفتاری سے آگے بڑھتے رہے......
مائیں آپس میں ملتی رہیں........
باتیں ہوتی رہیں.......
تنظیم گھوم گھوم کر اپنا کام کرتی رہی.......

اخبار، ٹی وی اور دوسرے ذرائع سے کی درندہ صفت میجر اور شیطان فوجیوں تک من چاہی خبریں پہنچائی گئیں۔ماحول تیّار ہو چکا تھا۔صرف راکھ کے اندر چھپی چنگاری کو ہوا دینے کی ضرورت تھی۔

بچوں کے سامنے مائیں کھڑی تھیں........

''تم پوچھا کرتے تھے نا، کہ تمہارا باپ کون ہے؟ کیا نام ہے؟ اور اب کہاں ہیں؟ اور ایک دن ہم نے تمہیں بتایا تھا کہ شہر کے سارے مرد مذہب کی تبلیغ کے لئے دوسرے ملک جا رہے تھے کہ سمندر میں ایک خوفناک طوفان آیا اور کشتی.........اب جب کہ تم سب بڑے ہو چکے ہو اس لیے وہ راز آج تمہارے سامنے فاش کر رہی ہوں۔''

''اب تم ہی نسل کشی کی اس جنگ میں ہمارے ہتھیار ہو۔

میڈیا کے ڈھولکی، میڈیائی ڈھولک کے ذریعہ پرانی قوم کے گھر گھر مرچ مصالحے

سے بھری ہوئی ان کی بیٹیوں کی سُرخ اور رنگین خبریں پہنچانے کا کام بڑی مستعدی کے ساتھ انجام دے رہے تھے۔ جو پرانی قوم کے لئے باعثِ شرم اور توہین آمیز بات تھی۔ ان میڈیائی خبروں کی وجہ سے اب وہ ساری دنیا میں سر اُٹھانے کے قابل بھی نہیں رہے تھے۔

میڈیائی ڈھولکی کی تھاپ بدستور جاری تھی........

اب ہر روز اخباروں کے پہلے صفحے پر ایک نئی اور انوکھی شادی کی خبر حاشیے کی زینت بنتی۔ جس میں سب سے خاص بات یہ ہوتی کہ لڑکی کے والد کی جگہ پرانی قوم کے اُن فوجیوں میں سے کسی نہ کسی کا نام ہوا کرتا اور حیرانی کی بات یہ تھی کہ کچھ کے ایڈریس بھی شامل رہتے۔

اس طرح شادی کی خبریں کئی ایک سال تک، ریڈیو میں، ٹی وی میں جگہ پاتی رہیں۔ ان خبروں کی اشاعت وتشہیر سے جنرل میجر، اس کے اعلیٰ حکام اور فوجیوں کے سینے پر سانپ لوٹنے لگے تھے۔ قوم کی بدنامی ہو رہی تھی۔ کچھ اپنے بھی لعنت کر رہے تھے۔ اور دوسرے تو طنز کے تیر پھینک ہی رہے تھے۔ ایسے میں میجر اور اُن کے ریٹائرڈ فوجی اندر ہی اندر ٹوٹنے اور بکھرنے لگے تھے۔ اپنی قوم کی عزت اور وقار کو لے کر یہ لوگ معاملے کو عدالت تک لے گئے۔ لیکن عدالت نے بھی دوٹوک فیصلہ شادی کے حق میں سنا دیا۔

اور ایک دن صبح چائے کے ہمراہ تازہ اخبار جنرل میجر کے سامنے تھا. پہلے ہی صفحے پر شادی کی ایک دھماکہ خیز سرخی ٹنگی تھی۔ وہ چونک گیا۔ لڑکی کا نام اس کی بیٹی کا تھا۔ ایک نام تو کئی ایک لڑکیوں کے ہو سکتے ہیں۔ اس خیال کے اُبھرتے ہی اس نے دماغ کی دیوار پر جمی شک وشبہات کی کائی کو جیسے ہی کھرچ کر الگ کرنے کی کوشش کی اچانک باپ کے نام پر نظر پڑ گئی۔ وہ اندر سے بُری طرح کپکپا گیا۔ ہاتھ سے چائے کی پیالی چھوٹ کر زمین پر گر پڑی۔ پیالی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے نظریں ہٹتے ہی اُس نے ایک بار پھر باپ کے نام کو پڑھنا چاہا۔ نام تو اُسی کا تھا۔ اور پتہ......؟ پتہ بھی اس کے ہی گھر کا تھا۔ آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

''ارے کیا بات ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' بی بی خالی ٹرے سنبھالے حیرت

بھری نگاہوں سے اُسے دیکھتی رہی۔

''لیکن ہماری بیٹی کہاں ہیں؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی سر اُسی طرح جھکائے جھکائے اس نے پوچھ لیا۔

''وہ! ارے لو......'' پیالی کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو ٹرے میں رکھتے ہوئے بولی۔''تم کل دیر رات کلب سے لوٹے تھے۔اس لیے بتانا بھول گئی۔ارے کیا نام ہے اُس کا؟ جس کا چہرہ بالکل تمہاری طرح ہے۔کل رات اس کی شادی تھی۔وہ اُس کے ساتھ ہی اُس کے گھر گئی ہے۔''

میجر کی ڈبڈبائی آنکھیں، تعفُّن اور سڑاند سے بھری ہوئی نسل کشی کی بیس سالہ پرانی دلدل میں دور تک دھنستی چلی گئیں۔

☆☆☆

تخلیق

کمہار کے ہاتھوں کی بنائی ہوئی مورتیاں، مورتی کلا کی دنیا میں کافی دادو تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ وہ پہاڑ کے سب سے اُونچی چوٹی کے ایک ایسے غار میں مورتیاں بنایا کرتا ہے جہاں سورج کی کرنیں پہنچنے سے قبل ہی دم توڑ دیتی ہیں۔

اس کمہار نے برسوں کی محنت و ریاضت کو بروئے کار لا کر ایک دن جب ایک شاہکار کی تخلیق کی تو وہ اُس کی خوبصورتی کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ خوشی کے مارے کمہار نے اُسے چوم لیا۔ اس مورت نے اندھیرے میں ہی اپنے تخلیق کار کو دیکھنے کی کوشش کی۔ لیکن دیکھ نہیں پائی۔ تب وہ اندھیرے میں غار کا چکر لگانے لگی۔ چکر لگاتے لگاتے تھک گئی۔ لڑکھڑائی۔ ٹھوکر لگی اور وہ رونے لگی۔ رونے کی آواز پہ کمہار دوڑتا ہوا اُس کے پاس چلا آیا۔

''رو کیوں رہی ہو تم......؟''

''دیکھتے نہیں! کہ میرے پاؤں میں چوٹ لگی ہے۔ کب تک ہم اندھیرے کی مار کھاتے رہیں گے۔ تم کہتے ہو کہ میں تمہارا شاہکار ہوں۔ تو کیا مجھے بھی لائن لگ کر اپنی باری کا انتظار کرنا پڑے گا۔ مجھ پر ترس کھاؤ اور مجھے اس اندھیرے سے باہر نکالو۔ روشنی کی دنیا تمہارے اس شاہکار کو دیکھنے کے لئے بیتاب ہے۔''

'' اس دُنیا کے بھی اپنے کچھ اصول

ہیں۔تم شاہکار ہو یہ ٹھیک ہے۔لیکن اس کے باوجود تمہیں دوسروں سے پہلے روشنی کی دنیا میں بھیج کر میں اپنے قانون کا گلا نہیں گھونٹ سکتا۔ ویسے تمہاری باری کے آنے کا مجھے بھی انتظار ہے۔''

''لیکن کیوں.......؟''

اس لئے کو تم میرا شاہکار ہو۔ روشنی کی دنیا میں تمہارے پہنچتے ہی چاروں طرف ایک ہنگامہ برپا ہو جائے گا۔ میرا فن آسمان کو چھو لے گا۔ ہر طرف ہمارا ہی چرچہ رہے گا۔''

تمہارا تو ہوگا ہی۔اس لئے کہ ایک تخلیق کار جہاں اپنی تخلیق سے پہچانا جاتا ہے وہیں ایک تخلیق یہ بتاتی ہے کہ اس کا تخلیق کار کیسا ہوگا؟''

اس کمہار نے بے شمار مورتیاں بنائی تھیں۔ آکاش پر اُگے تاروں کی مانند۔ وہ ساری مورتیاں اپنی اپنی باری کا انتظار کر رہی ہیں کہ کوئی اُسے بھی لینے کے لئے آئے گا۔ پسند کرے گا اور وہ پہاڑ کی تاریک چوٹی سے سرک کر روشنی کی دنیا میں چلی آئے گی۔ مسکرائے گی۔ناچے گی۔گائے گی۔ پوری دُنیا پر راج کرے گی۔

لیکن آج جب شاہکار مورت کی باری آئی تو اس نے پہلے خریدار کے ساتھ روشنی کی دنیا میں جانے سے صاف انکار کر دیا۔

''میں اس رنگ برنگی دُنیا میں نہیں جاؤں گی۔''

''کیوں.......؟'' کمہار کو اپنے شاہکار کے اس انکار سے کافی جھٹکا لگا۔

''اس لئے کو اندھیرا ہی میرا گھر ہے۔'' مورت نے اندھیرے غار کے اس کونے کی طرف اِشارہ کیا جہاں اُس کا وجود عمل میں آیا تھا۔

''لیکن تم بھول رہی ہو کہ اِس اندھیرے کا مالک میں ہوں۔جس کے ساتھ اور جہاں کہیں بھی بھیجوں گا، وہاں تمہیں جانا ہی پڑے گا۔'' کمہار نے بحث کے ایک پلڑے میں اپنی بات کے وزنی بٹکھرے کو رکھتے ہوئے مورت پر دباؤ بنایا۔

''میں کسی بھی حال میں وہاں نہیں جاؤں گی۔'' مورت نے بھی انکار کا ایک اور بٹکھرا چڑھا کر پلڑا برابر کر دیا۔

''یہاں تمہاری نہیں، میری مرضی چلے گی۔''

''اگر ہمیشہ خالق کی مرضی چلی ہوتی تو آدم اور حوّا گندُم کھانے کا گُناہ کبھی نہیں کر تے۔''

''نافرمان مورت! کیا تمہیں معلوم نہیں کہ تمہارا جنم میرے وجود سے ہوا ہے۔ تم سے قبل کتنی ہی مورتیاں وہاں جا چکی ہیں اور ابھی نہ جانے کئی اور مورتیاں میرے وجود سے نکل کر وہاں جانے کی آس میں اپنی آنکھیں بچھائے بیٹھی ہیں۔''

میرے آقا! مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ پھر بھی میں آج اپنی گستاخی سے باز نہیں آؤں گی۔''

گُستاخ مورت! تو تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ جو مورت تیرے پیچھے کھڑی ہے وہ تمہارے اس انکار سے کتنی خوش ہے۔ اگر تم نہیں جاؤ گی تو اُسے روشنی کی دُنیا میں بھیج دیا جائے گا۔ محلوں کی زینت بننے......''

میرے خالق! میں نے پہلے ہی کہا ہے کہ مجھے روشنی کی دُنیا سے کوئی مطلب ہے اور نہ ہی محلوں کی زینت بننے کا کوئی شوق ہے۔''

''دیکھو ابھی بھی وقت ہے سوچ لو۔'' کُمہار نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔'' تاریکی میں رہ کر تمہارا وجود بھی اتنا تاریک ہو جائے گا کہ ایک دن تاریکی تمہیں اپنے وجود کا حصہ سمجھ کر اپنے میں ضم کر لے گی۔ تب تم اپنے وجود کے لئے۔ اپنی شناخت کے لئے چیخو گی۔ تاریکی سے نکل بھاگنے کے لئے روشنی ڈھونڈ و گی۔ لیکن سورج اُس وقت تمہارے وجود سے اتنا دور ہوگا کہ تم اپنے وجود کو نہ دیکھ پاؤ گی اور نہ ہی کبھی خود کو پہچان سکو گی۔ اس لئے میری بات مان لو اور دُنیا کی رونق بننے کے لئے تیّار ہو جاؤ۔

کمہار کی باتوں پر مورت کے چہرے پہ طنزیہ تبسم کی لکیر نمودار ہوئی جو دیکھتے ہی دیکھتے گُم ہوگئی۔

''دیکھو میں تمہیں آخری بار کہہ رہا ہوں کہ تم اس کے ساتھ چلی جاؤ۔ یہ تُمہیں اپنی عمارت کے خوبصورت گوشے میں سجا کر رکھے گا۔ تم جب اُس چمکتی ہوئی دُنیا کو دیکھو گی

تو اس تاریک دُنیا کے خیال سے ہی کانپ اُٹھو گی۔''

'' فی الحال میں روشنی کے وجود سے کانپ رہی ہوں ؟۔" مورت نے اپنی کپکپاہٹ پر
قابو پاتے ہوئے کہا۔'' اگر مجھے بھیجنا ہے تو کسی ایسی جگہ بھیجئے جہاں سرخ سورج نہ اُگتا ہو۔ جس کے چاروں طرف خشکی ہی خشکی ہو۔''

'' نہیں میرے نقشے میں ایسی کوئی جگہ نہیں ہے۔ روشنی کی دُنیا میں تین حصّہ پانی ہی پانی ہے۔'' کمہار نے بے بسی کا اظہار کیا۔'' جہاں تین حصے پانی ہی پانی ہوں، وہاں اس مٹی کی بے جان مورت کا کیا کام ......؟ مجھے یہیں اپنے پاس کسی کام کے لئے رکھ لیجئے۔ میں مٹّی گوندھنے اور مورت بنانے میں آپ کی مدد کروں گی۔ لیکن روشنی کی اس دنیا میں کبھی نہیں جاؤں گی۔''

کمہار نے اُسے سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کی اور اس کی دلکشی کے لئے دنیا کے اسرار و رموز سے پردہ اُٹھایا۔

'' وہاں سورج نکلتا ہے تو پہاڑوں کی چوٹیاں اور سمندر کی سطحیں سنہری ہو جاتی ہیں۔ پہاڑوں کے وجود سے چمٹی برف کی چٹانیں جب اپنے اندر سورج کو اُترتے ہوئے د یکھتی ہیں تو کپکپاہٹ کے مارے اُس کے جسم سے پسینے چھوٹنے ہیں۔ یہی پسینہ جب پہاڑوں کی چوٹیوں سے سرک کر نیچے اُترتا ہے تو ندی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اور کھیت کھلیان مسکرانے لگتے ہیں۔ ہرے بھرے درختوں پر جب پرندے چہچہاتے ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے باغ ارم میں بلبل نغمہ سرائی کر رہی ہے۔ جب سرد ہوائیں خراماں خراماں چلتی ہیں تو بدن گلابی ہو جاتا ہے۔ گلاب کی نکہت جب ہواؤں کے ساتھ سفر کرتے کرتے سورج تک پہنچتی ہے تو آسمانی اُفق پر شفق کے بادل تیرنے لگتے ہیں۔ شفق کا سرمئی آنچل جب سورج کے سر پر لہراتا ہے تب سرمئی غبار پورے آکاش کو اپنے حصار میں قید کر لیتا ہے اور جب شب اپنا سیاہ دامن پھیلاتی ہے تو اُس کے بدن پر بے شمار ستارے ٹانک دیے جاتے ہیں۔ چاند اُس کی پیشانی سے اُبھر کر ساری رات سیاہ زلفوں سے آنکھ مچولی کھیلتا رہتا ہے۔ کبھی اپنی

نرم چاندنی سے بھٹکے ہوئے راہی کی رہنمائی کرتا تو کبھی شوخ کرن بن کر محبت کرنے والوں کے دلوں
میں اُتر جاتا ہے۔ روشنی کی یہ دنیا سات رنگوں کا ایک حسین مجموعہ ہے۔''
''واقعی تب تو وہ جگہ بہت حسین ہوگی......؟'' مورت نے اپنا چہرہ دوسری طرف کرتے ہوئے کہا۔ ''جنت سے بھی زیادہ۔''
''تو پھر تمہارا ارادہ کیا ہے.....؟'' کمہار اُس کے سامنے چلا آیا۔
''ارادہ......؟'' مورت کی طنزیہ مسکراہٹ ایک بار پھر اُس کے ہونٹوں پر آ کر ٹھہر گئی۔
کمہار اُس کی اس ادا پر جھلاّ اُٹھا۔
''تو اُس وقت تمہاری زبان تمہارے حلق سے نیچے کیوں اُتر گئی تھی۔ جب تمہیں بنانے کے لئے مٹی گوندھ رہا تھا۔'' جب میں نے تمہارا ڈھانچہ بنایا تھا، روشنی کے بارے میں بتایا تھا تو تم نے کیوں نہیں پوچھا تھا کہ روشنی کیسی ہوتی ہے۔ جب تمہارے سامنے روشنی رکھ کر سات رنگوں کے حسین امتزاج سے تجھے شاہکار کا روپ دے رہا تھا تو تمہاری آنکھیں اتنی چمک کیوں رہی تھیں۔'' کمہار نے اس طرح کے اور کئی سوال کر کے مورت کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔
'' تو پھر تمہارا یہ خوبصورت وجود کیسے عمل میں آ تا۔ تم خود بھی پانی سے بنی ہو اور پانی سے ہی ڈرتی ہو۔''
مورت کچھ توقّف کے بعد بولی۔'' آپ میرے مالک، خالق سب کچھ ہیں۔ آپ نے ہی مجھے مٹی سے مورت کا روپ دیا۔ مجھ جیسی بہت سی مورتیوں کو عزت دی۔ شہرت دی۔ کسی کو چوراہے پہ بٹھایا تو کسی کو پارک میں۔ کس کے اوپر ہار چڑھوائے تو کسی کو بھگوان کا روپ دے کر پانی کے حوالے کیا۔'' مورت کی بات کو بیچ میں کاٹتے ہوئے کمہار نے کہا۔
''تم پانی سے اتنا کیوں ڈرتی ہو۔ پانی تو ہماری زندگی ہے۔ پانی اگر نہیں ہوتا تو

میں مٹی ہی نہیں گوندھ پاتا۔ اور اگر ایسا ہے تو میں تمہارے اوپر ایک ایسا رنگ چڑھا دوں گا جس پر نہ کسی طوفان کا اثر پڑے گا اور نہ ہی کسی سیلاب کا۔''

''نہیں مجھے ایسی بے حس زندگی نہیں چاہیے کہ کوئی کچھ بھی کرے اور مجھے پتہ تک نہ چل سکے۔''

''تو پھر تمہیں چاند ستاروں کی دنیا سے کس زمانے کا بیر ہے کہ تم وہاں جانے سے ....'' کمہار کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی مورت نے جواب دے دیا۔

''وہاں ہر شئے کا وجود روشنیوں کے حصار میں قید ہے۔ مجھے تاریکی نے جنم دیا۔ اس لئے تاریکی مجھے عزیز ہے۔''

''بس کچھ ہی عرصے کی بات ہے۔ ہر کسی کو یہاں ایک خاص مدّت کے بعد تاریکی کی قبر میں دفن ہو جانا ہے۔'' کمہار نے اس کے وجود پر حقیقت کی روشنی ڈالی۔

''اگر ایسا سب کے ساتھ ہونا ہے تو پھر میں روشنی سے دوستی ہی کیوں کروں۔ بچھڑتے وقت بہت تکلیف ہوگی۔ اس لئے میں ابھی سے تاریکی کی اس قبر میں خود کو دفن کرنا نہیں چاہتی ہوں۔''

''تم ضد چھوڑ کر میری بات مان لو۔ اور روشنی کی دنیا میں جانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ یہ میرا آخری حکم ہے۔ اگر اس کے بعد بھی تم نے میری بات نہیں مانی تو میں تمہارے حسین چہرے پر کالک پوت کو اپنے سے بہت دور کر دوں گا۔'' کمہار نے اپنا آخری پتّا مورت کے سامنے پھینک دیا۔

''تم خالق ہو کر اپنے شاہکار کے ساتھ ایسا ناروا سلوک کرو گے ....؟'' مورت نے سوالیہ نظروں سے کمہار کی طرف دیکھا۔ ''مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔''

''حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کے ساتھ میں اِس سے بھی گھناؤنا سلوک کر سکتا ہوں۔'' کمہار نے اپنے ہاتھوں میں ہتھوڑا اور چھینی اُٹھاتے ہوئے کہا۔

''مورت گھبرا گئی۔'' ویسے میں نے سوچا تھا کہ اگر تم مان جاؤ گے تو میں تمہیں یہ سب کچھ جو ابھی بتانے جا رہی ہوں کبھی نہیں بتاتی۔ لیکن تم نے مجھے اپنی نظروں سے اتنا گرا

دیا ہے کہ میں اب سچائی آشکار کرنے پر مجبور ہوں۔''

''سچائی....... مجبوری....... آخر یہ سب ہے کیا........؟'' کمہار نے اپنی جھنجھلاہٹ پر قابو پاتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

''سچائی یہ ہے کہ آج بھی مجھے روشنی سے بے اِنتہا پیار ہے۔ مجبوری یہ ہے کہ میں اپنے خالق سے والہانہ عقیدت رکھتی ہوں۔'' مورت کے ایک ایک لفظ سے اپنائیت کی شیرینی ٹپک رہی تھی۔

''پیار.......عقیدت ....'' کمہار کی حیران آنکھیں مورت کے سامنے جب

پوری

طرح سے پھیل گئیں تب مورت نے اپنی نظریں جھکا لیں۔

''جب میرا خالق میری تخلیق کے لئے اپنی ساری زندگی تاریکی کی نذر کر سکتا ہے تو کیا میں اُس خالق کی شاہکار ہو کر اپنی پوری زندگی تاریکی کے حوالے نہیں کر سکتی.......؟''

مورت کی ان فلسفیانہ باتوں میں کمہار کو کافی دم نظر آیا۔ اُس نے خریدار کے سامنے ہاتھ جوڑ لئے۔

''ساری زندگی میں نے مورت کی تخلیق کی ہے۔ لیکن آج ایک مورت نے اپنی ساری زندگی تاریکی کی نذر کر کے ایک بار پھر میری تخلیق کی ہے۔ اس لئے میں اپنے تخلیق کار کا سودا نہیں کر سکتا۔''

مورت نے خوشی سے کمہار کا چہرہ چوم لیا۔

☆☆☆

انگڑائی

''نہیں دیدی نہیں! مجھ سے یہ دھندا نہیں ہوگا۔'' پدما ہاتھ جوڑے کھڑی تھی۔
''کیا کہا، نہیں ہوگا۔؟'' بال پکڑ کر روپ وتی نے اُسے بُری طرح سے جھنجوڑ دیا۔
''کیا اس کام کے لیے ہی مجھے تم یہاں لائی ہو دیدی۔؟''
''نہیں تو کیا انڈے دینے آئی ہو۔؟''
''نہیں دیدی، نہیں! مجھ سے یہ دھندا.....'' موقع ملتے ہی پدما نے اپنے بال چھڑائے اور روپ وتی کو ایک طرف ڈھکیلتے ہوئے دروازہ کی طرف دوڑ پڑی۔ روپ وتی گرتے گرتے سنبھل گئی تھی۔ اس لیے وہ فوراً اُس کے پیچھے تیزی سے لپکنے میں کامیاب ہوئی اور اس کی چوٹی پکڑ لی۔ پھر غصّے میں اس نے پدما کے نمکین گالوں پر زوردار طمانچہ جڑ دیا۔
''رنڈی بھاگتی کہاں ہے۔؟ پیر پکڑ کر توڑ دوں گی۔''
''نہیں بھگوان کے لیے مجھے جانے دو۔''
''حرامی کہیں کی۔ باپ رنڈیوں کے ساتھ دن رات سویا رہتا تھا اور بیٹی چلی شریف زادی بننے۔''

تھوڑی دیر تک پدما اپنے گالوں کو سہلاتی رہ گئی تھی۔ کچھ سوچتے سوچتے بڑی ہمّت کر کے پھر بولی۔'' دیدی! کیا تم مجھے کوئی دوسرا کام نہیں دے سکتیں؟''

''دوسرا کام؟'' روپ وتی کی ایک زوردار لات ہوا میں لہرائی اور پدما چاروں خانے چت ہوگئی۔ جیسے ہی اُٹھنے کی کوشش کی اوپر سے ایک اور لات۔''بولو دھندا کروگی کہ نہیں.......؟''

''نہیں دیدی۔ بھگوان کے لیے چھوڑ دو مجھے۔'' پدما اُس کے پاؤں پکڑ کر گڑگڑاتی رہی۔

''رنڈی کہیں کی۔ چھوڑ دیں تمہیں۔ پھر جو تمہارے مکان مالک کو چکتا کیا ہے وہ کون چکائے گا تمہارا یار.......؟''

''دیدی! میں کہیں سے بھی کچھ کر کے تمہیں.......''

ایک بار پھر روپ وتی کی لات ہوا میں لہرائی۔ پدما پر مُکّے کی بارش ہوتی رہی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ اَدھ مری سی ہوگئی۔

''بولو! تم دھندا کروگی کہ نہیں؟'' روپ وتی اس طرح سے اُسے پیٹ رہی تھی کہ پدما سے رہا نہیں گیا۔

''دیدی میں تیار ہوں۔ اب مت مارو مجھے۔ مت مارو مجھے۔''

پدما کے منہ سے ''ہاں'' سنتے ہی روپ وتی نے اُسے چھوڑ دیا۔ چھوڑتے ہی پدما لڑکھڑاتے ہوئے آہستہ آہستہ اُٹھی اور دوڑتے ہوئے روپ وتی کے سینے سے چمٹ گئی۔

چمٹتے ہی روپ وتی کے کانوں میں دور بہت دور سے آتی ہوئی اس کی چھوٹی بہن کی آواز، دیدی او دیدی ٹکرانے لگی۔

''پگلی روتی کیوں ہے؟ میں ہوں نا۔'' روپ وتی بھی اُس سے اُسی طرح چمٹ گئی۔

''دیدی اب مارو گی نہیں نا؟ دیکھو کتنا خون بہہ رہا ہے میرے ماتھے سے۔''

''مت رو پگلی! چُپ ہو جا۔'' بہتے ہوئے خون کو روپ وتی اپنے آنچل میں پوچھتی

ہوئی بولی۔ ''ایک دیدی کبھی اپنی چھوٹی بہن سے یہ سب کچھ بھی کرواسکتی ہے۔؟''

روپ وتی نے جب زور سے اُسے گدگدایا تو پدما اُس کے بدلے ہوئے روپے کو دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''لیکن پدما! تمہیں جینے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔''

''میں اس سے بھاگ کہاں رہی ہوں دیدی۔''

''کچھ کام وام بھی آتا ہے۔؟''

وہ بالکل بچوں کی طرح بولی........'' جیسے جھاڑو لگانا، کپڑے دھونا، برتن مانجھنا، کھانا بنانا، بچّہ کھلانا اور.....''

''ارے پگلی! اس کے علاوہ بھی کوئی کام آتا ہے تمہیں.......؟''

''ارے لو دیدی! اصل بات تو کہنا ہی بھول گئی۔ تھوڑا بہت سلائی ولائی کا کام کاج بھی آتا ہے مجھے۔''

''اچھا! تو پھر اب سوچنا کیا ہے۔ میں دو چار سلائی سینٹر کا پتہ دوں گی۔ وہاں جانا۔ کسی نہ کسی کو تمہاری ضرورت ہوگی۔ وہ تمہیں رکھ لے گا۔''

''وہ سب تو ٹھیک ہے دیدی۔ لیکن میں رہوں گی کہاں......؟''

''دیدی کہتی ہو اور پوچھتی ہو رہوں گی کہاں........؟''

زمانے کے اس عجیب وغریب چکّر نے پدما کو ایک نامی طوائف کے ساتھ تیسری منزل کے ایک ہی گھر میں رہنے کے لیے مجبور کیا تھا۔ سیڑھی سے ہوکر گزرنے پر جو کمرہ پہلے آتا تھا وہ روپ وتی کا تھا اور اس سے بالکل سٹا ہوا کمرہ پدما کا۔ دونوں کمروں کے بیچ ایک دروازہ تھا۔ دھندے کے وقت دروازہ بند رہتا تھا۔

قریب پانچ سال سے روپ وتی اس مکان میں رہ رہی تھی۔ دھندا اس نے یہیں شروع کیا تھا اور تب سے پدما کا باپ اس کا مستقل گاہک تھا۔ سڑک حادثے میں اس کی موت ہوئی تو روپ وتی اس کے گھر گئی۔ لیکن جب اُسے معلوم ہوا کہ پدما کا اب سنسار میں کوئی نہیں ہے۔ ماں کو مرے ہوئے بھی ایک عرصہ ہوگیا ہے تب اکیلی لڑکی کو دیکھ کر

روپ وتی سے رہا نہیں گیا۔ ایک تو وہ جوان تھی اور اس کے نین نقش بھی کافی تیکھے تھے۔ اس لیے وہ اس اُمید پر اُس کے گھر جانے لگی کہ دھندے میں اگر کام آ گئی تو ڈھلتی عمر کا وہ سہارا بن جائے گی۔

پدما کا گھر کرائے کا تھا۔ کئی ایک ماہ سے شراب نے اس کے باپ کو گھر کا کرایہ ادا کرنے نہیں دیا تھا۔ اس حادثے کے بعد مالک مکان نے جب گھر خالی کرنے کے لیے کہا تو پاؤں تلے زمین سکرنے لگی تھی۔ رشتہ داروں نے بھی آنا جانا بند کر دیا تھا۔ اور جانے، انجانے ہو گئے تھے کہ جوان لڑکی کو لے جا کر آج کے اس لالچی دور میں شادی بیاہ کا بوجھ کون اُٹھائے گا۔ اس وقت روپ وتی ہی کام آئی تھی۔ وہ اُسے اٹھا کر اپنے گھر لے گئی۔ لیکن جب پدما کو معلوم ہوا کہ وہ ایک نامی طوائف ہے تو اسے گھِن سی محسوس ہوئی تھی۔ اور جب روپ وتی نے پدما سے پیار بھرے انداز میں کہا تھا۔ ''اب تم میرے ساتھ میرے کام میں ہاتھ بٹاؤ گی۔'' تو اس وقت پدما کی آنکھوں میں غصّے کی لالی دوڑ گئی تھی۔ لیکن پھر اُس نے فوراً اپنے آپ کو سنبھال لیا کہ اس سنسار میں جہاں اپنوں نے تجھے دھتکارا ہے، وہیں اس طوائف نے تجھے........اگر یہ نہیں ہوتی تو پھر........وہ سنبھل گئی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کا چہرہ بالکل سنجیدہ ہو گیا تھا۔

''نہیں دیدی نہیں، مجھ سے یہ دھندا نہیں ہوگا۔'' پدما ہاتھ جوڑے رُوپ وتی کے سامنے کھڑے ہو گئی تھی۔

پھر اس کے ایک ہفتہ بعد ہی پدما کو ایک جگہ کام مل گیا۔ اس شام وہ خوشی خوشی گھر لوٹی تھی۔ روپ وتی پکوڑے بنا کر اس کی راہ بڑی بے چینی سے دیکھ رہی تھی۔ آتے ہی پدما نے اُسے اپنے کام کے بارے میں بتایا اور روپ وتی نے اس کے جواب میں اسے گرما گرم پکوڑے کھلائے۔

''دیدی! کیا تم یہ دھندا نہیں چھوڑ سکتیں؟'' پکوڑے کھاتے کھاتے وہ بول پڑی تھی۔

''کیوں، کیا ہوا ہے تمہیں؟''

''نہیں، کچھ نہیں دیدی! بس وہ کیا ہے دیدی کہ سینٹر کا مالک مجھے سمجھانے کے بعد پوچھ بیٹھا تھا۔ ''تمہارے گھر پر اور کون کون ہیں؟'' میں نے بتایا کہ میری ایک دیدی ہے۔'' لیکن جب اُس نے پوچھا کہ '' کیا کرتی ہے تمہاری دیدی'' تو جانتی ہو دیدی! اُس وقت میرا چہرہ شرم سے جھک گیا تھا۔ شرمندگی کو چھپانے کے لیے میں فوراً جھوٹ بول پڑی تھی کہ میری دیدی بھی گھر پر سلائی کا کام کرتی ہیں۔''

''پگلی! کیا تم سوچتی ہو کہ مجھے یہ دھندا اچھا لگتا ہے......؟''

''تو پھر تم یہ چھوڑ کیوں نہیں دیتی دیدی؟''

''اچھا تو اگر مجھے تھوڑا بہت سینا و پنا سکھا دے تو میں یہ کام بھی کرلوں گی۔''

''دیدی! تو نے آج میرے دل کی بات چھین لی۔ ڈرتی تھی کہ کہیں کچھ کہوں اور تمہیں بُرا لگ گیا تو......'' کچھ رک کر۔ ''دیدی اب میں تمہیں جی جان سے سکھاؤں گی۔ کل اپنا بھی ایک سلائی سینٹر ہوگا۔ کیسا رہے گا تب دیدی......؟''

''اچھا رہے گا۔ لیکن جانتی ہو پدما! مشین کے لیے پیسے چاہئے۔ پیسے کی مشین تو میرا دھندا ہے۔ جب کل پیسے ہو جائیں گے تو دیکھا جائے گا۔''

''دیکھا نہیں، بلکہ......؟''

''اچھا بابا اب سو بھی جاؤ۔ بہت تنگ کر چکی مجھے۔'' روپ وتی کی اس بات پر دونوں ایک ساتھ کھلکھلا کر ہنسیں اور اپنے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

وقت انگڑائی پر انگڑائی لیتا رہا.......

روپ وتی اور پدما میں آہستہ آہستہ کافی گہری دوستی ہوگئی۔ رات کے درد سے چور روپ وتی اکثر صبح دیر سے اُٹھتی اور ناشتہ اور دوپہر کا کھانا، سینٹر جانے سے پہلے ہی پدما ہنستے کھیلتے بنا لیتی۔ شام ڈھلے جب کام سے پدما تھکی ہاری گھر لوٹتی تو اسے آرام کا موقع دے کر روپ وتی چولہے کے سامنے بیٹھ جاتی۔ رات کے کھانے کے وقت دونوں ایک دوسرے کو اپنی رام کہانی سناتیں۔

''کل وہ میرا پھر آیا تھا۔''

''کون دیدی؟'' پدما ان دنوں اس طرح کی باتوں کو بڑے چاؤ سے سننے لگی تھی۔
''وہی جن کے بارے میں، میں اکثر کہا کرتی ہوں کہ بہت اچھا لگتا ہے مجھے۔''
''اچھا وہی سنہرے بالوں والا......'' پدما ہنس پڑی تھی۔
''ہاں وہی، بہت پیار کرتا ہے مجھے۔ جب بھی آتا ہے ایک عجیب سی خوشی دے جاتا ہے۔ اس کے ساتھ سوتے ہوئے مزا آ جاتا ہے۔ بہت مزا دیتا ہے وہ مجھے۔ میں تو ہر رات یہی پرارتھنا کرتی ہوں کہ وہی آئے۔''
''اچھا ایسی بات ہے دیدی......؟''
''ہاں رے پدما۔ نہ جانے کتنے گُر جانتا ہے وہ یہ سب کچھ کے۔ انگ انگ توڑ کر رکھ دیتا ہے میرا۔''
''اچھا پھر بھی وہ پیارا ہے؟''
پدما دھندا بدلنے کے لیے روپ وتی کو کئی بار کہہ چکی تھی۔ اس لیے آج سینٹر سے لوٹتے ہی اس نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ضرور دوٹوک لفظوں میں اپنی دیدی سے پوچھے گی۔
''یہ دھندا چھوڑو گی یا نہیں دیدی......؟''
''ہاں بابا، کہا نا کہ چھوڑ دوں گی۔''
لیکن کب دیدی......؟''
''بہت جلد پگلی۔''
''پرومِس دیدی!''
آج کی رات پدما کھانا کھا کر بستر پر گری تو روپ وتی کی سحر انگیز باتیں اُسے ایک کر کے یاد آنے لگیں۔ ایک ایک لفظ بوند بوند بن کر اس کی شریانوں میں اُترنے لگا تھا۔ اس کے اندر ایک ہلچل سی برپا ہو گئی تھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ رات کی میٹھی نیند نے پہلی بار اُس سے منہ پھیر لیا تھا۔ اس لیے اس رات جیسے ہی سیڑھیوں پر کھٹ کھٹ کی آواز اُبھری۔ اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ دروازے پر دستک کیا ہوئی۔ وہ سنبھل کر اس طرح بیٹھ گئی جیسے اس کے دل کے دروازے پر کسی نے دستک دی ہو۔ دروازہ کھُلنے کی آواز پر وہ پلنگ سے اُتر

گئی اور دروازے کے پاس پہنچ کر دروازے سے بالکل لگ کو وہ ایسے کھڑی ہوگئی جیسے وہ بھی دروازے کا ہی ایک حصہ ہو۔ کان لگا کر ان باتوں کو وہ اُس وقت تک سُنتی رہی جب تک پرندوں کی چہچہاہٹ کے ساتھ دروازہ کھُلنے کی آواز نہ ہوئی اور کھٹ کھٹ سیڑھیاں نہ اُتر گئی۔

پھر کچھ ہی دنوں کے بعد دونوں نے ایک سکنڈ ہینڈ مشین کی خریداری بھی کر لی۔اس لیے اب ہر روز پدما اُسے کچھ نہ کچھ سکھانے لگی تھی۔شروع شروع میں روپ وتی کا دل کام میں نہیں لگتا تھا۔کبھی دل رہا تو کیا اور کبھی نہیں والی بات تھی۔لیکن آہستہ آہستہ اُس نے کافی کچھ سیکھ لیا۔

ادھر روپ وتی کے کمرے میں جب تک گا ہک رہتا پدما دروازے سے لگی رہتی۔رات کی تاریکی میں اُبھرنے والی ننگی آوازیں اُس کے کانوں میں ٹپ ٹپ شہد ٹپکاتی رہتیں۔تب اُس کے اندر کوئی چیز انگڑائی پر انگڑائی لینے لگتی۔مدہوشی کی ایک پراسرار کیفیت اس کے اوپر طاری ہو جاتی۔ایسے میں وہ بجلی کی چمک اور کڑک کے اصولوں پر چل کر ننگی آوازوں سے بہت آگے نکل جانا چاہتی۔اُس وقت اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک ہوتی۔

چھٹی کے دن روپ وتی کے ساتھ پدما کو بھی مارکیٹ جانا تھا۔لیکن ننگی آوازوں سے آگے نکل جانے کی چاہ نے بہانہ بنایا اور وہ رُک گئی۔

''نہیں !تمہارے پیٹ میں جب درد ہے تو مت جاؤ۔میں اکیلے ہی مارکیٹ چلی جاؤں گی۔''

روپ وتی کے گھر سے نکلتے ہی پدما نے سیڑھی کے دروازے کو بند کیا۔چولہا جلایا۔ہاتھ والے پنکھے سے جھل کر اُس کا منہ سرخ کیا۔اور سینچے کے نوکیلے حصے کو آگ کے اندر قریب دو تین انچ ڈال کر اُسے گرم کیا.......بار بار یہ عمل دہرایا گیا۔تب کہیں جا کر پدما دروازے میں ایک ایسی جگہ سوراخ بنانے میں کامیاب ہوئی، جہاں سے وہ روپ وتی کا بیڈ آسانی سے دیکھ سکتی تھی۔ایسا کرنے میں اُسے بڑا مزہ آیا تھا لیکن اس عمل کے دوران پسینے پسینے ہوگئی تھی اس لیے فوراً اُسے نہانا پڑا تھا۔

اُس رات کھٹ کھٹ کی آواز کے ساتھ پدما دروازے کے پاس پہنچی۔ سوراخ میں آنکھ رکھتے ہی وہ خوشی سے اندر ہی اندر جیسے اُچھل پڑی تھی۔ وہی سنہرے بالوں والا روپ وتی کا شہزادہ اس کے سامنے تھا۔ روپ وتی نے اس کے بارے میں جو کچھ کہا تھا اُسے پدما اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی۔

پھر ہر رات کا یہی معمول ہو کر رہ گیا۔ کھٹ کھٹ کی آواز پر چونکنا، دستک پر اُٹھنا، سوراخ میں آنکھ رکھ کر لذّت میں ڈوبی ہوئی آواز کے اُتار چڑھاؤ کے پیچھے بھاگنا۔ بھاگتے ہی رہنا۔ بھاگتے بھاگتے اپنے ہی انگ کو چور چور کر دینا۔

دن اسی طرح گزرتا رہا۔ اور ایک دن اسی طرح روپ وتی چولہے کے سامنے بیٹھی تھی۔

''اب زیادہ دن نہیں جی سکوں گی پدما۔''

''ایسی اَشُبھ بات مت کرو دیدی۔''

''کیسے نہ کروں؟ انگ انگ چور چور ہو گیا ہے میرا۔''

''تو پھر تم یہ دھندا چھوڑ کیوں نہیں دیتیں دیدی۔''

''لیکن اکیلے میں اکثر یہ سوچتی ہوں کہ دھندے کو چھوڑ کر میں کیا کروں گی؟''

''سلائی تو تم سیکھ ہی رہی ہو دیدی۔''

''ہاں! وہ تو ہے۔ لیکن پدما! اگر دھندا بدل کر میں بھی تُمہاری طرح جینے کی کوشش کروں، تو کیا تُمہاری طرح مجھے بھی کوئی اپنائے گا؟''

''پہلے دھندا بدل کر تو دیکھو دیدی۔ وقت کے ساتھ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ کیوں کہ وقت کی صرف ایک انگڑائی کسی بھی انسان کی زندگی کو بدلنے کے لئے کافی ہے۔''

اس دن پدما کی باتوں پر روپ وتی گہری سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ ٹھیک اُس بزنس مین کی طرح جو ایک دھندا چھوڑ کر جب دوسرے دھندے کو اپنانا چاہتا ہے تو وہ ''ہاں'' اور ''نہیں'' کے درمیان تھوڑی دیر کے لیے پھنس کر رہ جاتا ہے کہ پہلے والا دھندا اُس کے لیے بہتر ہے یا دوسرا۔ اگر پہلے والا سودمند ہے اور اگر اُس نے اُسے ہی بدل دیا تو پھر کیا ہو

گا۔؟ کشمکش کے اس جال میں روپ وتی کے فیصلے کا پنچھی کچھ دیر کے لیے پھڑ پھڑا تا رہا۔ پھر جال توڑ کر آزاد ہو گیا۔

''میں آج سے ہی یہ دھندا بدل رہی ہوں پدما۔''

''سچ دیدی؟''

''ہاں پدما۔ میں بھی اب عام عورتوں کی طرح عزّت بھری زندگی جینا چاہتی ہوں۔''

''دیدی!'' پدما خوشی کے مارے روپ وتی کے سینے سے لپٹ گئی۔

''میں لائی تھی تجھے طوائف بنانے، اور تم نے مجھے طوائف سے کیا بنا دیا۔'' وہ پدما کی پیشانی کو جذباتی انداز میں چومنے لگی تھی۔

''یہ سب میرا نہیں دیدی! اُس بھگوان کا کرم ہے۔''

اس رات دونوں بہت خوش تھیں۔ اس لیے بھی کہ روپ وتی ایک نئی زندگی کی شروعات کرنے والی تھی۔ آج بار بار اُس کے کانوں سے سلائی مشین کی آوازیں ٹکرا رہی تھیں۔

مشین کی آواز میں اُبھرتے ہی وہ خود کو کسی سلائی سینٹر میں پاتی۔ آج اس نے ایسے بھی سلائی کے سلسلے میں بہت کچھ پدما سے پوچھا تھا۔ ''تمہارا سینٹر کتنا بڑا ہے؟ کتنی مشینیں ہیں تمہارے یہاں؟ وہاں کام کرنے والی عورتیں کیسی ہوتی ہیں؟ میں اگر کام شروع کروں تو کتنا کما لوں گی......؟ اور اس کے ہر سوال کا تسلی بخش جواب دے کر پدما ہر بار اس معلم کی طرح مسکرا دیتی تھی جو شریر اور کند ذہن بچوں کو راہ راست پر لانے کا ہُنر رکھتے ہیں۔

دونوں اکثر ہر رات نو بجے کے آس پاس اپنے اپنے کمروں میں سونے جایا کرتی تھیں۔ لیکن گیارہ بجنے کے بعد بھی آج پدما روپ وتی کے پاس بیٹھی تھی۔

''اچھا دیدی! اب سو بھی جاؤ۔ رات کافی ہو گئی ہے۔'' پدما پلنگ سے اُٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگی تب اُسے شرارت سوجھی۔ ''دیدی! کہیں کوئی تمہارا اپنا مل گیا تو پھسل مت جانا۔'' اس شرارت پر روپ وتی ہولے سے مسکرا کر صرف اُسے ''پگلی'' کہہ کر رہ گئی تھی۔

پدما کے جانے کے بعد روپ وتی نے اپنے جسم کو بستر پر رکھنے کی جیسے ہی کوشش کی، اس کی ناک میں ایک عجیب سی بدبو سما گئی۔ وہ فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی۔ تھوڑی دیر وہ یوں ہی کھڑی رہی اور اپنی آنکھیں شکن آلود چادر پر ڈال دیں۔ ہر سلوٹ میں اُسے رینگتا ہوا ایک کالا ناگ دکھائی دیا۔ پھر اُس نے شکن آلود چادر کے ایک کونے کو پکڑا، زور سے کھینچا اور ایک کونے میں گھما کر پھینک دیا۔ پھر الماری سے سفید بے شکن چادر نکال کر سلیقے سے اُسے پلنگ پر بچھایا۔ کچھ دیر تک وہ بے شکن چادر کی سفیدی کو دیکھتی رہی۔ ہاتھ سے آہستہ آہستہ سہلاتی رہی۔ مسکراتی رہی........سفید بے شکن چادر پر ہی لیٹتے ہی اُسے ایسا لگا جیسے وہ آج زندگی بھر کی ساری تھکن سے عاری ہوگئی ہے۔ اس لیے وہ خود کو پھولوں کی طرح ہلکی محسوس کرنے لگی تھی۔ ایک نئی زندگی کی شروعات کرتے ہوئے اُسے بڑا لطف آ رہا تھا۔ پلکیں بند ہوتے ہی اُس کی آنکھوں میں حسین اور سُہانے خواب ایک ایک کر کے اُترنے لگے تھے۔

باہر رات کا گھنا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔

بارہ کے سامنے گھڑی کے دونوں کانٹے جیسے ہی مل کر ایک ہوئے سیڑھیوں پر کھٹ کھٹ کی وہی جانی پہچانی آواز اُبھری۔ پدما ہمیشہ کی طرح آج بھی سنبھل کر بیٹھ گئی۔ دروازے پر دستک ہوتے ہی وہ دروازے کے قریب چلی آئی۔ سوراخ سے جب اُس نے روپ وتی کے کمرے میں جھانکا تو اُسے بے خبر سویا ہوا پایا۔ پھر آنے والے نے کچھ رُک کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ روپ وتی سُگبُگا کر رہ گئی۔ تیسری بار جب آنے والے نے دروازے پر کچھ اور زور لگایا اور پیاری آواز میں ''روپ وتی! اری او روپ وتی؟'' کہہ کر پکارا تو وہ جاگ اُٹھی۔ گھڑی پر ایک نظر ڈالتے ہوئے بولی۔ ''اتنی رات کو کون مردود آ گیا نیند خراب کرنے۔'' اور وہ آہستہ آہستہ دروازہ کی طرف بڑھ گئی۔ دروازہ کھلتے ہی سنہری بالوں والا خوبرو نوجوان سامنے نظر آیا۔

اُس وقت پدما پر سوچ کی بجلی گر پڑی تھی ''اب کیا ہوگا؟ یہ مرد تو روپ وتی کی کمزوری ہے۔ کیا روپ وتی اُسے بھگا دے گی یا پھر اس کے ساتھ ہمیشہ کی طرح........لیکن آج روپ وتی اُسے دیکھتے ہی پہلے کی طرح نہ ہی مسکرائی تھی اور نہ ہی گرم جوشی کے ساتھ

اس کا استقبال ہی کیا تھا۔ بلکہ اُس کے آگے بڑھتے ہی وہ تیزی سے پیچھے ہٹ گئی تھی۔ یہ دیکھ کر پدما حیران رہ گئی۔ اب سنہرے بالوں والا اپنی بانہیں پھیلائے مسکراتے ہوئے روپ وتی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ سُنہرے بالوں والا اور پدما کے درمیان روپ وتی کھڑی تھی۔ اِدھر سنہرے بالوں والا روپ وتی کی طرف جیسے جیسے بڑھ رہا تھا، اُدھر پدما کی آنکھیں ویسے ویسے بند ہوتی جا رہی تھیں۔ اور سحر میں ڈوبے ہوئے روپ وتی کے وہ الفاظ ''بہت مزا دیتا ہے وہ مجھے۔ نہ جانے کتنے گُر جانتا ہے وہ یہ سب کچھ کے......'' اس وقت اُس کے کانوں میں شہد کی مٹھاس گھول رہے تھے۔

''وہیں رُک جاؤ۔ آگے مت بڑھنا۔''

''یہ کیا کہہ رہی ہو جاناں......'' روپ وتی کی اس حرکت پر وہ حیران و ششدر کھڑا رہا۔ ''بتاؤ! بات کیا ہے؟'' پھر اس نے بڑھ کر روپ وتی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ روپ وتی غصے میں آپے سے باہر ہو گئی۔ زوردار جھٹکا دے کر پہلے اُس نے اپنا ہاتھ چھڑایا اور حقارت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے ایک بھرپور طمانچہ سُنہرے بالوں والے کے گالوں پر جڑ دیا اور دانت کچکچاتے ہوئے چلائی۔

''نکل جا حرامی یہاں سے۔''

اس جملہ کی بازگشت ابھی کمرے میں گونج ہی رہی تھی کہ یکا یک دھڑام کی ایک زوردار آواز کے ساتھ پدما کا دروازہ کھُلا۔ وہ سایہ اور بلاؤز میں تھی۔ بلاؤز پسینے سے پوری طرح بھیگا ہوا تھا۔

''دیدی!'' اس نے روپ وتی کو پکڑ کر بُری طرح سے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ پدما کو اس حال میں دیکھ کر روپ وتی بالکل سکتے میں آ گئی۔ ''تم اِسے نہیں بھگا سکتیں دیدی......! کتنا سُکھ دیتا ہے یہ تجھے......کتنا سُکھ دیتا ہے یہ مجھے......'' اور وہ سنہرے بالوں والے کا ہاتھ پکڑ کر ہیجانی کیفیت میں اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

اسٹرائیکر

''میں شادی نہیں کروں گا۔''

''تو کیا زندگی بھر کُنوارا رہے گا۔آج میں ہوں کل نہیں رہوں گی۔تمہاری دیکھ بھال کون کرے گا؟اب مجھ سے گھر کا کام وام بھی نہیں ہوتا۔''

''ماں مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔''

''میں اب کچھ بھی سننا نہیں چاہتی۔تم دس سال سے اسی طرح ٹالتے رہے ہو۔اور اب جوانی کی عمر تمہیں چھوڑ رہی ہے۔شادی کیا بڑھاپے میں کرے گا۔تمہارے لئے آج ہی میں نے ایک اچھی سی لڑکی دیکھی ہے۔لڑکی والوں کو تم بھی پسند ہو۔زبان میں نے دے دی ہے۔اگر اس بار تمہاری کوئی بھی مجبوری سامنے آئی تو میں خودکشی کرلوں گی۔میں یہ بھول جاؤں گی کہ میرا کوئی بیٹا بھی ہے۔''

ماں زاروقطار روتے روتے بلک پڑی تھی۔

وجے بوڑھی ماں کی سیاہ پُتلیوں میں ڈوبتے اُبھرتے درو کے بے کراں سمندر کو دیکھ کر کانپ اُٹھا۔ جسے انکار کے پتھر نے جنم دیا تھا۔اور اب درو بڑھ کر اس حد کو چھونے لگا تھا جہاں انکار کا ایک چھوٹا پتھر بھی ماں کے

بوڑھے جسم کو چور چور کر کے مٹی میں ملانے کے لئے کافی تھا۔ وجے کا دل دہل اُٹھا اور اُس کے ہاتھ سے انکارگا پتھر چھوٹ گیا۔

پہلی رات.......!

جب بے شمار الجھنوں کو سمیٹے دروازے پر دستک دینے آئی تو اس وقت وہ سر سے پیر تک پسینے میں بُری طرح غرق ہوگیا تھا۔ ایک انجانے خوف سے اُس کا دل دھونکنی کی طرح دھڑکنے لگا تھا۔ جو اس کی نس نس میں سرایت کر گیا تھا۔ جس سے وہ چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ لیکن جب نہیں کر پایا تب وہ اپنی ہی زندگی سے آہستہ آہستہ دور بھاگنے لگا تھا۔ شاید بھاگنا آج اس کا مقدر تھا۔ اس لئے کو اسی بھاگ دوڑ میں اس کی عزت تھی۔ اس کا وقار تھا۔ اس کی مردانگی تھی۔

لیکن گھر کی عزّت کی خاطر عورتوں نے زبردستی اُسے دلہن کے کمرے میں ڈھکیل دیا۔

دونوں آمنے سامنے تھے۔

بیچ میں کیرم بورڈ رکھا ہوا تھا۔ جس پر کالی اُجلی اور سیاہ گوٹیاں پھیلی ہوئی تھیں۔

''تمہارا ہاتھ کیوں تھر تھرا رہا ہے؟''

''ڈر لگ رہا ہے۔''

''کیوں......؟''

کہیں مجھ سے ایک بھی گوٹی نہیں لگی تو......''

کھیل، کھیل ہے۔ کھیل کوئی بھی ہو، اگر ٹیم کے حوصلے بلند ہیں تو وہ ہارا ہوا میچ بھی جیت جاتی ہے۔ لیکن اگر کھیلنے سے پہلے ہی ٹیم کے حوصلے پست ہو جائیں تو جیت اُس سے روٹھ جاتی ہے۔ ایسا ہی کچھ وجے کے ساتھ بھی ہوا۔ اسٹرائیکر پکڑنے سے پہلے ہی وہ حوصلہ کھو بیٹھا۔

''کیا ہوا ہے تمہیں؟''

''نہیں، کچھ نہیں........''

"نہیں کچھ تو ہے جو تم مجھ سے چھپا رہے ہو۔''

''وہ کیا ہے کہ آج میں ذرا تھک گیا ہوں۔''

''زیادہ تھک گئے ہو۔''

''ہاں اس لئے کھیل نہیں سکوں گا۔ رات کافی ہو گئی ہے۔ دیکھو نیند بھی آ رہی ہے۔ صبح جلدی اُٹھنا بھی ہے۔ کہتے ہوئے اُس کی زبان لڑکھڑا گئی تھی۔ اس نے بڑی ہمّت کر کے پیشانی پر اُگ آئے پسینے کی بوندوں کو کانپتے ہاتھوں سے پونچھا تھا۔ اُس وقت اُس کی اُداس آنکھوں میں ایک عجیب ہی منظر تھا، جو اُسے تھوتھو کر رہا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکنوں کی بے ترتیبی اُسے اب نارمل کی سمت لے جا رہی تھی۔ اُس کا سر آٹا چکی کے پتھر کی طرح گھومنے لگا تھا۔ زمین اُس کے سر کے اُوپر تھی اور آسمان پیروں تلے۔ وہ وہاں سے اس طرح اُٹھا جیسے اس کے اوپر منوں مٹی کا بوجھ ہو۔ وہ گرتے گرتے بچا۔ اُس وقت اُسے ایسا محسوس ہوا کہ ایک پل بھی اگر اس نے خودکشی کرنے میں دیر کی تو زمین پھٹ پڑے گی اور وہ اُس میں سما جائے گا۔ یا پھر عمارت ہی اُس کے اُوپر گر پڑے گی اور وہ دب کر خاک کا حصّہ ہو جائے گا۔

دُلہن تھکی ہاری تھی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد وجے نے سمجھ لیا کہ وہ سو گئی ہے۔ اس لئے خودکشی کے ارادے کر ذہن کی ڈور سے باندھے وہ چھپتا چھپا تا سامنے والے میدان کے بیچ بنے گہرے اور چوڑے کنویں کے پاس پہنچ گیا۔ رات چاندنی تھی چھلانگ لگانے سے پہلے اُس نے نیچے جھانکا۔ پانی کی سطح پر تیرتی ہوئی چاندنی میں اُسے اپنی بوڑھی ماں کا چہرہ نظر آیا۔ وہ کانپ کر رہ گیا۔ پھر اُس کی بھیگی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہوتی چلی گئیں۔

خواب کا در کھلا۔ بوڑھی بھکارن کشکول لئے کھڑی تھی۔

''بیٹا کچھ ملے گا.......؟''

اُس نے بوڑھی بھکارن کی طرف آنکھ بند کر کے اپنا چہرہ بڑھا دیا۔ آنسوؤں کے دو موتی سے قطرے کشکول میں گرے۔ بوڑھی بھکارن مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ وجے اپنی اُداس آنکھوں میں بوڑھی ماں کی تصویر بسائے، ان کے ارمانوں بھرے راستوں

پردھیرے دھیرے بہت دیر تک چلتا رہا۔ پھر گر پہنچ گیا۔ گھر سے باہر نکلتے یا آتے سوئے اُسے کسی نے دیکھا نہیں تھا۔ اس لئے دروازہ آہستے سے کھول کر دبے پاؤں وہ اندر داخل ہو گیا۔

''کہاں گئے تھے.....؟'' وہ دلہن کی آواز پر چونک پڑا۔

''کہیں نہیں۔ وہ باہر ذرا ضرورت سے.....'' کہتے ہوئے اُس نے اپنی زبان کی پتھریلی زمین پر ببول کے پیڑ کو اُگا ہوا پایا۔ اور اندر ہی اندر درد سے بلبلا اُٹھا۔

رات بھر دلہن کی آنکھیں ارمانوں کی سیج پر بے خواب رہیں........

شادی کے بعد ہر لڑکی کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ خوش گفتار راتوں کی ڈور کو زیادہ سے زیادہ سمیٹ سکے۔ لیکن بے چاری شالنی سسرال کی تین راتیں ہی گزار سکی۔ تین رات نہیں۔ بلکہ ایک۔ ایک نہیں بلکہ آدھی اور وہ بھی ادھوری۔ سسکتی اور تاریک رات۔ وقت کی تھکن کا الزام پہلی شب پر گیا تھا۔

لیکن وہ دو راتیں........

شالنی سے وجے وہ راتیں بھی بڑی چالاکی اور مہارت سے چرانے میں کامیاب ہوا تھا۔

دوسری رات آئی تو دوست کی شادی کا خوبصورت بہانہ اُسے ہوٹل کے بستر تک لے گیا۔ اور تیسری رات کو اُس نے جان بوجھ کر پارٹی کے ہنگامے اور شور وغل کی نذر خود کو کر دیا تھا۔ اس طرح چوتھی رات کے آنے کی باری ہی نہیں آئی اور دلہن کو شادی کی ریت کے مطابق میکے بھیج دیا گیا۔

جاتے وقت وجے نے کہا تھا۔'' آج میں ساتھ جاتا۔ لیکن کمپنی کی ایک ضروری میٹنگ ہے۔ کچھ ہی دیر قبل خبر ملی ہے۔ جانا ضروری ہے۔ ویسے دو چار دن کے اندر ضرور آؤں گا۔''

''نہیں وہ بات نہیں ہے۔ فرصت جلدی اس لئے نہیں مل پائے گی ٹینٹ، باجا، اور دوسری شادی بیاہ کی چیزوں کا حساب کتاب بھی کرنا ہے۔ ماں سے یہ سب کچھ ہونے سے

رہا۔اس لئے میرا یہاں رہنا ضروری ہے۔اچھا تم اپنا خیال رکھنا۔غلطی معاف کرنا۔''
شالنی صبح سے شام تک سورج کے ہمراہ دروازے پر بیٹھی اُس کا سراپا انتظار کرتی۔ساری رات کروٹیں بدل بدل کر ایک آس میں پوری رات دیتی۔لیکن وجے نہیں آیا۔

شالنی دسہرا سمیٹ کر جب میکے سے سسرال آئی تو یہ جان کر حیران رہ گئی کہ وجے اُسے چھوڑ کر دوسرا شہر جا چکا ہے۔
وجے جہاں گیا تھا وہاں بھی اس کی کمپنی کی ایک برانچ تھی۔دو سال قبل کمپنی کی طرف سے اُسے وہاں بھیجا رہا تھا۔لیکن اس کا دل تو اس شہر کی رونقوں میں گم تھا۔رونق اُس کی ماں تھی۔ماں کہ جسے وہ ٹوٹ کر چاہتا تھا۔اور یہاں ماں کے بہت سارے ملنے جلنے والے تھے۔اس لئے یونین کے لیڈروں سے مل کر اپنا تبادلہ ملتوی کروا دیا تھا۔
اس شہر میں رہنے کے لئے اس نے خود کو بہت ہی آسانی کے ساتھ راضی کر لیا تھا۔گھٹ گھٹ کر جینے سے بہتر ہے انسان مر جائے۔ لیکن آج کچھ لے دے کر وجے اس گھُٹن آلود ماحول میں بھی مسرّت کی خوشبو سمیٹتا رہا۔یوں تو ماں کی جدائی کسی کے لئے بھی عذاب سے کم نہیں ہوتی۔اس کے لئے بھی تھی۔اس لئے پہلے ہفتے کی تمام راتوں کو اس نے جاگتی آنکھوں پر گزر نے دیا تھا۔دل پر سیاہ چٹان رکھ کر وہ پہلے اس شہر میں رہنے کے لئے خود کو منایا، مجبور کیا اور آخر میں تیار کر لیا۔اس سے پہلے کبھی اس نے یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ ماں کو اس طرح تنہا چھوڑ کر اس شہر میں رہنے اور بسنے کے بارے میں سوچ بھی سکے گا۔

لیکن وقت کا کیا ہے؟ وہ جب، جس سے جو چاہتا ہے کروا لیتا ہے۔وہ آتا ہے اور چلا جاتا ہے۔لیکن آنے اور جانے کے درمیان چھوڑ جاتا ہے، وجے جیسے کمزور انسان کو بے بس اور کر کے۔کمزور اور بے بس انسان وقت کی انگلی پر ناچتا ہے۔اس لئے نئے شہر میں اُسے کوئی خاص پریشانی نہیں ہوئی۔لیکن ماں کا دل تو ماں دل ہوتا ہے۔اکثر وجے کو پریشان کر جایا کرتا۔اور جب بھی وہ پریشان ہوتا۔خط کے راستے سے لفظ لفظ چل کر ماں

سے مل لیتا۔

پہلے وجے ہفتے میں خط بھیجا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ وقفہ بڑھتا رہا اور بڑھتے بڑھتے مہینے سے جا ملا۔ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو اسے تنخواہ ملتی۔ وہ ماں اور بیوی کے ماہانہ اخراجات کے علاوہ دوسری ضروری چیزوں کے پیسے بھی ڈاک سے بھیج دیا کرتا۔ سبھی خطوط ماں کے نام ہوتے تھے۔ ہر خط میں وہ اپنا دل نکال کر رکھ دیتا تھا۔ جسے صرف ایک بوڑھی آنکھیں ہی دیکھ سکتی تھیں۔ خط میں بیوی کے لئے بھی بھرتی کے چند ایک جملے ہوتے۔ دونوں خط پڑھ کر خوش ہو جایا کرتیں۔ جواب میں بیوی خط لکھا کرتی۔ ہر خط میں آنے کی بات لکھتی۔ کبھی جھوٹی باتیں بھی لکھ جاتی۔ ''ماں کی طبیعت خراب ہے۔ اُن کی آنکھوں کی روشنی کم ہونے لگی ہے۔'' کبھی اپنے دل کا رونا سناتی۔ مجھے رات رات بھر نیند نہیں آتی ہے۔ کل آپ خواب میں آئے تھے۔ اور وہ پہلی رات کا......سچ مچ آپ بڑے بے وفا ہیں۔ یہاں میرے دل پر کیا گزرتی ہے۔ آپ کو پتہ ہی نہیں چلتا۔ پتہ نہیں اجنبی شہر میں اجنبی لوگوں کے درمیان آپ کا دل کیسے بہل رہا ہے۔ آپ نے گزشتہ خط میں لکھا تھا کہ اگلے ماہ کی دوسری تاریخ کو آ رہا ہوں۔ کیوں نہیں آئے؟ کہیں وہاں کوئی حور پری تو نہیں مل گئی۔

شالنی کے خطوط شکایتیں لئے وجے کے روبرو ہوتے۔ وجے ان شکایتوں کو بڑی صفائی سے صاف کر دیا کرتا۔ معمولی گھرانے کی کم پڑھی لکھی، گائے جیسی سیدھی سادھی بیوی کی خوبصورت باتوں کے جال میں وجے پھنس کر رہ جاتا۔ لیکن ہر بار وہ شالنی کی شکایت بھری باتوں کو اپنے دوسرے خط کے ذریعہ اس طرح رفو کرتا جیسے کوئی رفوگر پھٹے ہوئے کپڑے کے ساتھ مہارت دکھاتا ہے۔ ''اس ماہ ضروری کام میں پھنس گیا تھا۔ اس لئے نہیں آ سکا۔ اگلے ماہ کی دوسری تاریخ کو آ رہا ہوں۔ آتے ہی ساری شکایتیں دور کر دوں گا سمجھی......!''

اور ایسی باتوں پر گائے جیسی سیدھی سادھی بیوی یہ سمجھتی کہ اس بار اُس کا شوہر آ ہی رہا ہے۔ اگلے ماہ کی دوسری تاریخ کو شالنی صبح سے شام تک آئینے کے پاس بیٹھی سنگھار پٹار کرتی۔ کبھی مسکراتی تو کبھی باتیں کرتی۔ اور کبھی اپنے حسن کے نکھار کو دیکھ کر مچل

مچل جاتی۔اس دن گھر کے سارے سامان کو قرینے سے سجاتی۔زیادہ وقت پلنگ کے اردگرد سجانے میں گزار دیتی۔پلنگ کی سفید چادر کو وہ بار بار اُٹھاتی جھاڑتی پھر بےشکن اُسے بستر پر ڈال دیتی۔تکیے کو بار بار دیکھتی۔کبھی ایک کو اُٹھا کر اِدھر رکھتی تو کبھی دوسرے اُٹھا کر اُدھر۔ اور کبھی ایک کے اُوپر ایک رکھ کر دونوں کی اونچائی ناپنے میں اتنا محو ہو جاتی کہ گھنٹوں اس میں بیت جاتے۔پھر اپنے آپ میں مسکراتی دونوں کو الگ کر کے خود باتھ روم چلی جاتی اور گھنٹوں جھرنے کے ٹھنڈے پانی کے نیچے بیٹھی رہتی۔

دوسری تاریخ بدلنے تک شالنی اپنی انتظار بھری آنکھیں دروازے پر رکھتی۔ ہر آہٹ پر چونکتی۔ ہر آنے جانے والے پر ایک نظر ڈالتی۔لیکن وجے نہ آتا۔شالنی انتظار کے کرب میں ڈوب جاتی۔ ماں بھی اُداس ہو جاتی۔جب شالنی ماں کو اُداس پاتی تو چہرے پر مسکراہٹ کا غازہ مل کر تسلّی کے دو بول سے ماں کے ممتا بھرے دل کو خوش کرتی اور اُنہیں اُمید کی سنہری ڈور سے باندھ دیتی۔

''ان کو وہاں بہت سارا کام دیکھنا پڑتا ہے۔اس بار بھی کوئی ضروری کام آڑے آ گیا ہوگا۔یا پھر چھٹی نہیں ملی ہوگی۔دور بھی تو کوسوں کا ہے۔اگلے ماہ کی دوسری تاریخ کو وہ ضرور آئیں گے۔میرا دل کورہا ہے۔ہاں!''

قریب سال بھر آسمانی اُفق پر سورج ہر روز ڈوبتا اُبھرتا رہا۔لیکن وہ نہ ہی نکلا اور نہ ہی ڈوبا.......

ہر موسم لوٹ کر آتا ہے۔لیکن یہاں فرقہ پرستی کا سرخ موسم جو بادل بن کر ہمارے سروں پر چھایا رہتا ہے،کبھی نہیں چھٹتا.......کہ آج یہی ہماری وراثت کا انمول رتن ہے اور اس کی پاسداری ہی ہمارا سب سے بڑا دھرم ہے۔دھرم کا اولین مقصد ہے۔

وجے کا شہر بھی اسی مقصد کے حصار میں قید تھا۔اس لئے یہاں کے لوگ آتش گیر ہواؤں کے اسیر ہو گئے تھے۔پولس بھی نوکری کے ڈر سے فرض شناسی پر اُتر آئی تھی۔جرائم پیشہ افراد گرفتار ہو رہے تھے اور جیل کی دیواریں آہستہ آہستہ موٹی ہوتی جا رہی تھیں۔ مقصد حکومت کا بالکل صاف تھا کہ اگر زیادہ دنوں تک سرکار کو بنائے رکھنا ہے تو ایسے لوگوں

سے جلوس کو پاک رکھا جائے۔تبھی شہر کے آسمان میں امن کا سفید جھنڈا لہرایا جائے گا۔
لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس لئے کو مقرّر تاریخ سے ایک دن قبل آتشی جلوس کی نمائندگی کرنے والے نیتا گن یہاں آئے اور اپنے اپنے ننگے بچوں کے تن چھپانے کے لئے رات کی آدھی سیڑھی پر چڑھ کر امن و امان کے لہرات سفید جھنڈے چُرا لے گئے۔
پھر ہونا کیا تھا........
لاکھوں کا جلوس تھانے کے قریب آ کر ٹھہر گیا۔سامنے دوسرے مذہب کی عبادت گاہ تھی۔ ہزاروں لوگ وہاں جمع تھے۔یکا یک ہزاروں اور لاکھوں کے مجمع میں کھلبلی مچ گئی۔ لاکھوں کے ہاتھوں میں طرح طرح کے ہتھیار تھے اور ہزاروں کے چہرے پر بنتے بگڑتے سوالات........
پھر ہوا وہی جس کا ڈر تھا۔
لاکھوں نے مل کر تھانے کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔اور اپنے ساتھیوں کی رہائی کا مطالبہ کرنے لگے جو شریف النفس اور تہذیب کا سر چشمہ تھے۔ اِن میں کچھ ایسے بھی تھے۔جن کے نام گلی کوچوں میں بکتے تھے۔عورتیں اُنہیں دیکھ کر اپنا چہرہ چھپا لیتی کہ کہیں ان بے چاروں کو شرم نہ آ جائے۔
جب ان شریفوں کو چھوڑنے سے پولس صاف انکار کر گئی تو ماحول میں ایک عجیب سی وحشت طاری ہو گئی۔جس کے حصار میں تھوڑی ہی دیر کے بعد سارا شہر چلا آیا۔رات ہوئی اور سارا شہر آگ کے دہکتے ہوئے گولے میں بدل گیا۔ ہر سمت تیر، بم، آگ، دھواں، چیخ، لوٹ مار اور زنا بالجبر کا بازار گرم ہو گیا۔
وجے کا گھر غیر محفوظ علاقے میں تھا۔ جہاں ایسے حالات میں خود کو بچانا، شیر کی گھپا سے زندہ لوٹ آنے کے مترادف تھا۔شہر کی حالت نازک سے
نازک تر ہوتی جا رہی تھی۔ کہیں کہیں سے گولی اور بم کی ملی جلی آوازیں بھی آنے لگیں تب وجے اپنے غیر محفوظ گھر کو چھوڑ کر پچھواڑے سے ہوتا ہوا میدان کی طرف بھاگ
کھڑا ہوا۔اور میدان کے بیچوں و بیچ گھنی جھاڑیوں کو محفوظ جان کو وقتی طور پر اُسے اپنی پناہ گاہ

بنا لیا۔ یہاں پہنچ کر اُسے ایسا لگا جیسے دنیا کے نقشے میں سب سے محفوظ جگہ یہی وہ جھاڑیاں ہیں جہاں چھپ کر وہ اپنی جان بچا سکتا ہے۔ اس لئے یہاں اُسے کچھ سکون سا ملا تھا۔ لیکن جب ہوا تیز چلتی اور سوکھی پتّیوں میں پھڑ پھڑاہٹ پیدا ہوتی تب وہ اندر سے کانپ کر رہ جاتا۔ کبھی اپنی گردن سیدھی کرتا۔ کبھی اپنی سانس روک لیتا۔ کبھی اندھیرے میں نظر اِدھر اُدھر دوڑاتا۔ کبھی بھاگنے کے لئے کھڑا ہو جاتا۔ لیکن بھاگ کر کہاں جائے......؟ سوچ کر ہی اس کی روح کانپ جارہی تھی۔

اس طرح خوف و ہراس کے درمیان اس نے رات کا آدھا پہر گزار دیا۔ گولی اور بم کی آوازیں اُس کی روح کو چھید رہی تھیں۔ آگ کی لپٹوں کو جب بھی وہ آسمان میں بلند ہوتے ہوئے دیکھتا تو اسے ایسا لگتا جیسے آج کی رات پوری انسانیت ہی اس آگ میں جل کر راکھ ہو جائے گی۔

انسانیت کی لاش ایک ایک کر کے جلتی رہی۔ وہ کبھی اپنی آنکھیں بند کرتا اور کبھی کان کے اُوپر اپنے دونوں ہاتھ رکھ لیتا۔ لیکن آنسو تھے کے بہے جارہے تھے۔ وہ زندہ بچے گا بھی کہ نہیں۔ اپنی ماں سے دوبارہ مل پائے گا کہ نہیں۔ یہ سوچ کر وہ اندر ہی اندر ٹوٹنے بکھرنے لگا تھا۔

پھر یکا یک کچھ ایسا ہو کہ اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ کسی کے قدم بڑی بے رحمی کے ساتھ پتیوں کو اپنے بوٹوں سے روندتے ہوئے جھاڑیوں کو چیرتے ہوئے اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ پھر نزدیک ہوتی بوٹوں کی آواز سے اُسے سمجھتے دیر نہیں لگی کہ ایک نہیں بلکہ وہ دو ہیں۔ ڈر کے مارے اس کے جسم کا سارا خون اس کے خون کی نلی میں جمنے لگا تھا۔ سانس اس کی رُکی کی رُکی رہ گئی تھی۔ وہ فوراً وہاں سے بھاگ کھڑا ہونا چاہتا تھا۔ لیکن ایسے میں کہاں جائے۔ بھاگ کر بھی وہ انہی لوگوں کے بیچ گھر جائے گا اور مارا جائے گا۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ بوٹوں کی آواز اس کے بالکل قریب آ کر رُک گئی۔ لیکن رات کی تاریکی اور جھاڑیوں نے مل کر اسے جیسے کچھ دور کر دیا تھا۔ اس لئے بہت پاس آ کر بھی بوٹ والے وجے سے بےخبر رہے۔ اس وقت موت کو اپنے سے اتنے قریب پا کر وہ بری طرح سے گھبرا

گیا تھا۔ ڈر کے مارے سر کو گھٹنوں پر رکھ کر اس نے اپنی آنکھیں موند لیں اور دونوں ہاتھوں سے اپنے گھٹنوں کو مضبوطی سے جکڑ کر اپنی سانسوں کو اپنے سینے میں اس طرح رو کے رکھا جیسے وہ بھی جھاڑی کا ہی ایک حصہ ہو۔ اس باعث جھاڑیوں سے اُٹھتی ہوئی سرگوشیاں اُس کے کانوں سے ٹکرانے لگیں۔

''تمہارا کیا خیال ہے کہ یہیں لٹا دیا جائے۔؟''

''ہاں!''

''لیکن چلو۔ دیر مت کرو۔''

وجے گھٹنے میں سر دیئے بہت دیر تک اُسی طرح بیٹھا رہا۔ پھر اُسے سب کچھ سمجھ میں آ گیا۔ پہلے لڑکی یا تو بیہوش تھی یا پھر زور سے کسی نے اس کا منہ دبا رکھا تھا۔ لیکن اُس وقت بھی اُس کی دبی دبی سی سسکی اُسے صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ سسکی گھنٹہ بھر کے بعد ہچکی میں بدل کر یکا یک خاموش ہوگئی۔

اب وجے کا سر گھٹنے میں نہیں تھا۔ نہ ہی وہ کپکپا رہا تھا۔ بلکہ اُس وقت اُس کے جسم کے ایک خاص حصے میں عجیب سی سنسناہٹ پیدا ہوگئی تھی ۔ جس پر وہ قابو رکھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ کہ تبھی رات کی جھاڑیوں سے اُبھرتی ہوئی سرگوشیاں ایک بار پھر اس کے کانوں سے ٹکرائیں۔

''بے چاری!''

''تمہارا کام تو ادھورا نہیں رہا نا.......؟''

''نہیں۔''

''چلو اچھا ہوا۔ جاتے جاتے ہم دونوں کو سورگ کا مزہ چکھا گئی۔''

پھر دونوں شیطانی قہقہہ لگاتے ، جھاڑیوں کو چیرتے باہر نکلے اور تیز تیز قدموں کے ساتھ رات کے اندھیرے میں بستی کی طرف لوٹ گئے۔

وہی سرگوشیاں اور وہی سنناہٹ طوفان کا شور بن کر اُس کے اندر اُترتی رہیں۔ اب اُس کے اندر نہ ہی کوئی ڈر تھا اور نہ خوف۔ بلکہ جسم کے ایک خاص حصّے کی سختی نے اس

کے اندر ایک نئی تازگی بھر کر دوبارہ زندگی سے جوڑ دیا تھا۔اندھیرے کو چیرنے کے لئے اس نے پہلے اپنی جیب سے لائٹر نکالا، آن کیا اور پھر مدھم روشنی کے ہاتھوں سے جھاڑیوں کو چیرتا ہوا وہ اُس طرف بڑھ گیا، جہاں کچھ دیر قبل سسکیاں ہچکیوں میں بدل کر خاموشی کی ردا میں لپٹ گئی تھیں۔

وہاں پہنچتے ہی اس کے قدم رُک گئے.......لائٹر کی ہلکی روشنی میں بھی اس نے دیکھ لیا تھا۔وہ ایک حسین وجمیل لڑکی کی لاش تھی۔اس کے جسم کی ہلچل تھی کہ بڑھتی ہی جارہی تھی۔ اور وہ اُسے دیکھے جارہا تھا۔لڑکی کے خوبصورت چہرے پہ جہاں دانتوں کے نشان تھے، وہیں جسم کے دوسرے حصے ناخنوں کی تیز دھار سے کراہ رہے تھے۔اور جگہ جگہ سے ڈھلکا ہوا لہورنگ درد کی کہانی سنارہا تھا۔ لمبے لمبے بال گرد آلود اور بکھرے ہوئے تھے۔آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔سر ایک طرف ڈھلک گیا تھا۔کپڑے کے چیتھڑے جھاڑیوں میں اٹکے ہوئے تھے اور کچھ لاش کی بغل میں بے ترتیب پڑے ہوئے تھے۔

یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد وجے کی آنکھوں کی سیاہ پُتلیاں برہنہ جسم کے نشیب وفراز پرناچنے لگیں۔ناچتے ناچتے اُس کی تیسری ٹانگ دائرے سے جیسے ہی اُلجھی وہ دھڑام سے گر پڑا۔شیطان تو ہمیشہ سے موقع کی تاک میں تھا۔فوراًاس کی پشت پر سوار ہوگیا اور بولا:

''یہ شالنی جیسی جیتی جاگتی عورت تو نہیں جو سرد اور گرم کے فرق کو لفظوں کا پیراہن دے سکے گی۔اس لئے جس طرح چاہتا ہے کھیل۔''

پھر جب کھیل شروع ہوا تو وجے نے اسٹرائیکر سے گوٹی پر ہٹ لگائی۔

اور وجے نے یہ بورڈ جیت لیا۔

☆☆☆

کُتّے والی

''کُتّے والی!''

''ارےاوکتّے والی!!''

یہ آوازیں کبھی کسی نکّڑ سے، کبھی کسی گلی سے، کبھی کسی برآمدے سے، کبھی کسی گھر کے اندر سے، کبھی بچوں کی توتلی زبان سے، کبھی بوڑھوں کے غول سے، کبھی جوانوں کے درمیان سے، اور کبھی........کبھی یہاں سے اور کبھی وہاں سے اُبھر کر قطرہ قطرہ جب اُس کے وجود میں اُترتیں تو وہ بھرپور آسودگی سے ہم کنار ہو جاتی اور اُسے چالیس سال کی عمر میں بھی ایسا لگتا جیسے دنیا کا سب سے خوبصورت نام یہی ہے۔

سنیتا پہلے ان پھبتیوں سے بھاگنا چاہتی تھی۔ لیکن بھاگ نہیں پائی کہ حقیقت سے منہ موڑنا اس کے بس میں نہ تھا۔ اور اس نے یہ کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ ''سنیتا'' سے ''کُتّے والی'' بن جائے گی۔ اور یہی نام اس کی شناخت کا ذریعہ بنے گا۔ شروع شروع میں اُسے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ لوگ اسے ''سنیتا'' کہہ کر پکاریں۔ لیکن آہستہ آہستہ ''کتے والی'' اس کے کانوں کو ایسا بھا

گیا کہ اُسے اپنا نام ''سنیتا'' ہی انجانا سا لگنے لگا۔ اور کبھی اس نام میں وہ اس طرح کھو جاتی کہ گھر والے اُسے ''سنیتا........سنیتا'' پکار رہے ہوتے اور وہ نہ ''ہوں'' کر رہی ہوتی اور نہ ہی ''ہاں'' کہ وہ تو ''کُتّے والی'' ہے۔ ''کُتّے والی'' کو لے کر پہلے کئی بار لوگوں سے سُنیا کی تو تو میں میں ہوئی۔ کئی کے بٹن ٹوٹے۔ ایک دو کے گال بھی اس چکّر میں سُرخ ہوئے۔ لیکن وہ ایسے موڑ سے گزرتے وقت جہاں ان پھبتیوں کا سامنا ہوتا، چیخ چیخ کر یہ بتانے میں کوئی عار نہیں سمجھتی کہ لفظ ''کُتا'' کے پیچھے ہوئے معنی کی کون سی دنیا آباد ہے۔ لیکن آگے بڑھتے ہی وہ خود سے اُلجھ جاتی کہ اُس نے کتّے کو اتنا چاہا ہے تو اس میں لوگوں کا کیا قصور۔ وہ تو ایسی چاہت کا کوئی نہ کوئی نام دیں گے ہی۔

کشمکش کی اس گھنی چھاؤں میں خود کو پانا اور پاکر کھو دینا۔ کھو کر پالینا اور یہ سلسلہ ....سلسلہ در سلسلہ چلتے رہنا۔ کتنا عجیب ہے......!

''مرد کے بغیر عورت کا وجود نامکمل ہے۔''

فلم ''عورت'' دیکھتے وقت من پسند اداکارہ کی زبان سے یہ جملہ سن کر وہ کانچ کی طرح چیخ چیخ کر اپنی ہی کرچیوں سے خود کو لہولہان کر گئی۔ اُس دن اُس اداکارہ کے نام سے ہی کراہیت سی ہونے لگی تھی۔ اس لئے اس نے اس کی خوبصورت تصویر کو جسے اپنے ڈرائنگ روم کی دیوار پہ نمایاں جگہ چسپاں کیا تھا کا لک پوتھ کر کھڑکی سے جب تک باہر نہیں پھینکا تب تک

اسے چین نصیب نہیں ہوا۔ اس کے باوجود وہ دن بھر روتی رہی تھی۔ حالانکہ وہ بھی دنیا کی ہر عورت کی طرح یہ جانتی تھی کہ مرد کے وجود کے بغیر عورت بھی مکمل کہاں ہوسکتی ہے۔ لیکن اس کے بعد بھی وہ مردوں

کی پرچھائیں سے خود کو پاک رکھنا چاہتی تھی۔ وہ زیادہ تر اپنے روم میں ہی رہا کرتی تھی۔ باہر آتے جاتے وقت اُسے جب بھی یہ محسوس ہوتا کہ کسی مرد کی آنکھیں اس کے وجود پر آ کر ٹھہر گئی ہیں تب اس کے جسم کے ایک ایک حصے میں سختی آ جاتی۔ اور آنکھیں لہو میں ڈوب جایا کرتیں۔

سنیتا بچپن سے ہی پڑھنے میں کمزور تھی۔ میٹرک کم نمبروں سے پاس کرنے کے بعد بھی انگریزی مسکین کی اسے دھنی تھی؟۔لیکن اس کے باوجود آئی۔اے کی دوسالہ زندگی میں اس نے کبھی انگریزی کا کلاس نہیں کیا۔صرف اس لئے کہ انگریزی کلاس لینے والا ایک مرد تھا۔ وہ اپنے ٹیچر کو بھی عام مردوں کی صف میں رکھتی تھی۔ یہاں تک کہ اُس نے اپنے باپ کو بھی اس صف میں لا کھڑا کیا تھا۔اور پھر ایک دن جب اس نے انہیں ماں کے ساتھ ویسی ہی عجیب حرکت کرتے ہوئے دیکھا تو اس دن اس کی آنکھیں دیوار پر ٹنگی ہوئی بندوق کی طرف بڑھ گئی تھیں۔گھر میں شادی بیاہ کی باتیں جب بھی اُچھالی جاتیں،اس کا دل چاہتا کہ ماتا پتا کا منہ نوچ لے اور چلّا چلّا کر پوچھے اگر شادی ہی محبت اور محبت ہی شادی، تو پھر میری دونوں بہنیں........؟

سنیتا نے اس کُتّے کو اپنے یہاں اُس وقت سے پال رکھا ہے، جب پلّے کی آنکھیں نرم ونازک جھلّی میں پوشیدہ تھیں۔دس سال قبل جب اپنی کھلی آنکھوں سے اُس نے پہلی بار دنیا دیکھی تو خود کو سُنیتا کی گود میں پا کر بڑا فرحت بخش احساس ہوا تھا۔ پلّے نے جب اپنے ننھے ننھے پیروں سے دھرتی کی سطح پر بڑھنا شروع کیا تو سنیتا کے معصوم چہرے پر مسکراہٹ کی لکیریں ڈوبنے اُبھرنے لگی تھیں۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دونوں ایک دوسرے میں گھُل مل گئے۔

سُنیتا نے پلّے کا نام سورج رکھا تھا۔سورج کی روشنی سے وہ اپنی تاریک زندگی کو روشن کرنا چاہتی تھی۔شاید آسمان میں چمکتے ہوئے سورج کی روشنی اُس کی تاریک زندگی کو جگمگانے کے لئے کافی نہ تھی۔اس لئے اس نے اس سورج کا سہارا لیا تھا۔کہنے کو کہا جاسکتا ہے کہ ساری دنیا کا سورج ایک ہے۔تاہم اندھیری راہوں میں بھٹکنے والے مسافر اپنی راہ کو روشن کرنے کے لئے موجودات کی دُنیا سے پرے اپنی تخیُّلاتی کائنات میں روشنی کی ایک دنیا آباد کرتے لیتے ہیں۔ اور یہ روشنی اُنہیں ملتی ہے محبت کی گرمی سے، جو اُن کی قربت میں سانس لینے والا اُنہیں عطا کرتا ہے۔اس طرح سورج اس کا ہم نوا بن بیٹھا تھا۔

سورج نے وقت کے ساتھ اپنا قد اُونچا کیا تو سُنیتا اسے پارک لے جانے لگی۔

رنگین فواروں کے قریب پختہ بنچ اور کبھی ہرے ہرے مخلی فرش پہ دونوں بیٹھے نظر آتے۔ دوروپہ اشوک کے پیڑ سے گُل مہر تک۔ اور گلاب کے باغ سے تالاب کے کنارے کنارے دوڑتے ہوئے دونوں بہت دور نکل جاتے۔ گیند پھینکنے لانے اور چھونے کا سلسلہ اُس وقت تک جاری رہتا جب تک کہ رات کی سیاہی اپنے پر پھیلا کر خوف کا احساس نہ دلا نے لگتی۔

کار ڈرائیو کرتے وقت بھی سورج سُنیتا کے ہمراہ اگلی سیٹ پر ہوتا۔ شاپنگ میں بھی دونوں ساتھ رہتے۔ جہاں جہاں سُنیتا جاتی، وہاں وہاں سورج کا جانا اتنا ہی ضروری ہو جاتا، جتنا کہ سورج کے نکلتے ہی روشنی کا پھیل جانا.......غسل بھی دونوں ساتھ کرتے۔ سُنیتا جس ٹاویل سے اپنے ملائم اور بھیگے ہوئے جسم کو صاف کرتی، اُسی ٹاویل سے سورج کے نرم وروئیں دار جسم کو اپنی انگلیوں سے آہستہ آہستہ ایک اہتمام کے ساتھ کچھ اس طرح سے پوچھتی، جیسے اُسے ڈر ہو کہ یہ مخملی غلاف اُدھڑ نہ جائے۔ جب کبھی سورج بیمار پڑتا تو سُنیتا اُداس اور پریشان ہو جاتی۔ نہ کسی سے بات چیت کرتی۔ نہ ہی کسی کام میں حصہ لیتی۔ بس اُداس عالم میں سورج کے پاس بیٹھی اس کے مخملی جسم کو دھیرے دھیرے سہلاتی رہتی۔ فون پر

ڈاکٹروں سے رائے مشورہ لیتی۔ قیمتی دواؤں کا ڈھیر لگا دیتی۔ اس خوف سے کہ کہیں سورج کو کچھ ہو گیا تو وہ اِس تاریک دنیا میں اکیلی رہ جائے گی۔ پھر کوئی سچائی اور محبت کی روشنی اس کے وجود کو نہیں چھو سکے گی۔ پُرخلوص، بے داغ اور بے لوث پیار پھر اُس کی دنیا میں لوٹ کر نہیں آئے گا۔ اُس کی ایسی ہی فضول حرکتوں سے گھر والے پریشان ہو جاتے۔ اُسے ڈانٹ پڑتی لیکن سُنیتا پر اس کا کوئی اثر نہ پڑتا۔

سُنیتا جسم تھی تو سورج اس جسم میں زندگی کی لہر دینے والی آتما۔ یوں تو سورج کو پانے کے بعد سُنیتا کو دُنیا کی رنگینیوں سے کوئی مطلب نہیں تھا۔ لیکن ایک بار ایک عزیز کی ضد پر پارٹی میں شرکت کی حامی بھر لی۔ جب پارٹی میں وہ سورج کے ہمراہ گئی تو چوکیدار نے اُسے ہال سے باہر رکھنے کی تاکید کی۔ سُنیتا اس کی غیر اخلاقی حرکت سے بھنا گئی۔ اس کے

بعد پھر اُس نے کسی پارٹی میں شرکت نہیں کی۔
''تم جتنا پیار ایک کُتّے کو دیتی ہو، اگر اتنی ہی شدّت سے کسی اور کو چاہو تو تمہارا مستقبل سنور جائے گا۔تم ہی بتاؤ! بھلا کُتّے کو پوجنے سے تمہیں کیا ملتا ہے......؟ ارے کُتّے، کُتّے ہوا کرتے ہیں، انسان نہیں۔'' ایک سہیلی نے اُسے طنز کا نشانہ بنایا۔
''ٹھیک کہہ رہی ہے کہ کُتّے، کُتّے ہوا کرتے ہیں، انسان نہیں اور یہ بات بھی بہت اچھی ہے۔ ورنہ آج کا انسان تو گلی کوچوں میں گندی چیزوں کی تلاش میں پھرنے والے آوارہ کُتّا بن چکا ہے۔ چلو کُتّے نے اپنی شناخت تو نہیں کھوئی۔ اور نہ ہی آج کے انسانوں کی طرح وہ بے وفا ہی ہے۔'' اُس کے اس فلسفیانہ خیال کو قہقہوں کے طوفان میں اُڑا دیا گیا تھا۔
سُنیتا کا جنم ایک خوشحال کرانے میں ہوا تھا۔ گھر سے کچھ ہی دور پر اُس کے والد کی ایک چھوٹی سی فیکٹری تھی۔ جہاں تیس کے آس پاس مزدور کام کیا کرتے تھے۔ باپ کی موت کے بعد اُس نے تمام مردوں کی جگہ عورتوں کو بحال کر لیا تھا۔ حالانکہ اس سے اس کی فیکٹری کو کافی نقصان ہوا۔لیکن سُنیتا کو اس کا ذرا بھی افسوس نہیں ہوا۔ پھر کچھ ہی دن بعد ماں بھی اس دنیا سے کوچ کر گئی۔ اب وہ گھر میں اکیلی رہ گئی تھی۔کبھی یہ دو بہنیں تھیں۔
ایک کا نام مونیکا تھا اور دوسری کا رنجیتا۔ عمر اٹھارہ انیس کے قریب رہی ہوگی۔
سُنیتا اس وقت بارہ برس کی معصوم بچی تھی۔ لیکن اس عمر سے جُڑی یادیں ایسی تھیں۔جس نے اُسے بارہ برس کی عمر میں سنجیدہ اور عمر رسیدہ بنا دیا تھا۔ یادیں جس نے اُسے تیرگی کے اتھاہ سمندر میں دھکیل دیا تھا اور نفرت کی ایک دنیا اُس کے دل میں آباد ہوگئی تھی۔نفرت کی دنیا تو ہمیشہ تاریک ہی ہوا کرتی ہے اور اس تاریکی میں صرف وہی روشنی سچی روشنی اپنے وجود کو منوا سکتی ہے جو حقیقی محبت کے بطن سے پیدا ہوئی ہو۔
دونوں بہنیں سُنیتا کو بے حد چاہتی تھیں۔ ماں نے تو صرف جنم دے کر ایک عورت کا ازلی فرض ادا کیا تھا،لیکن اس کے بعد ایک ناپختہ زندگی کو مستحکم زمین پر کھڑا کرنے کا بار اُن کی دونوں بہنوں نے سنبھال لیا تھا۔

''بھوں......بھوں........بھوں.......''

گم سم اور تصورات کی دنیا میں سُنیتا کو بھٹکتے ہوئے دیکھ کر سورج زوروں سے بھونکنے لگا۔

''کیوں چلاّ رہا ہے پگلے......؟''سُنیتا نے ماضی سے پلٹتے ہوئے سورج کو اپنی گود میں بھرلیا اور تھپتھپاتے ہوئے بولی۔''میں تمہیں چھوڑ کر کہیں تھوڑے ہی گئی تھی۔''

کچھ دیر تک دونوں ایک دوسرے کو پیار کرتے رہے۔ یکا یک سُنیتا کی نظر سامنے کی دیوار سے جا ٹکی۔ اُس کی بڑی بہن اس کے سامنے کھڑی تھی۔ پھر اُس کی آنکھوں کے سامنے کل ہی کل چھاتا چلا گیا۔ وہ کل جس کے تصور سے اُس کے بدن کا رواں رواں کانپ اُٹھتا تھا۔

گلاب چہرہ، کنول آنکھیں، سیاہ زلفیں اور اس پر سڈول گداز بدن.......واقعی ! منیکا کافی خوبصورت تھی۔

رات کی تنہائیوں میں اُس کے وجود پر انگڑائیوں کا موسم چھایا کرتا تھا۔اُس کے اندر اُبھرتے ہوئے پر شعلہ جذبوں کی کوئی تھاہ ہی نہیں تھی۔ خوابوں کی دنیا میں چہروں کی ایک بھیڑ ہوتی، جہاں قہقہوں اور موسیقیوں کا طوفان ہوتا اور وہ نشہ کی کیفیت میں سرشاری کا مزہ لیتی........تب اُس کے قدم ڈگمگاتے۔اور وہ ایک ایسے وقت میں جب انسان ڈوبنے والا ہوا اُبھرنے کی کوشش کرتی رہی۔مگر اُبھر نہ سکی۔

رات کی تاریکیاں اور دن کے اجالے ......قہقہے اور موسیقی کی دنیا اس کے گداز بدن سے رس کی بوند میں پیتی رہیں، اور وہ دھیرے دھیرے اپنے وجود کے احاطے میں ایک چاند کو طلوع ہوتا ہوا دیکھنے لگی۔ لیکن وہ سورج جو چاند کو روشن کرتا ہے، اپنی روشنی دینے سے انکار کرتا رہا۔ اور پھر ایک دن وہ اپنی پیشانی پہ اُبھرے ہوئے حصّے کو آئینے میں دیکھ کر بے چین ہو اُٹھی۔ اور اب بے چینی کافی بڑھ گئی تب وہ بے نور چاند کو اپنی کوکھ میں چھپائے سمندر کی عمیق گہرائیوں میں اُتر گئی۔ سُنیتا کی آنکھوں نے جب یہ سب کچھ دیکھا تو اُس کے ذہین نے یادوں کی شکل میں ان باتوں کو محفوظ کرلیا اور اس کے ساتھ ہی اس کے

دل کا ایک گوشہ ذرا سخت گیا۔ جیسے پگھلے ہوئے لوہے پر سختی کی ہلکی سی پرت جم گئی ہو۔

ایک طرف سُنیتا گہری سوچ میں گم تھی تو دوسری طرف سورج یہ سوچ رہا تھا کہ سُنیتا اُس سے ناراض تو نہیں ہے۔ اسی کشش و پنج میں وہ کچھ دیر تک پھنسا رہا۔ آخر جب اس سے رہا نہیں گیا تب اس نے بڑھ کر سُنیتا کے پلّو کو کھینچنا شروع کر دیا۔ سُنیتا نے چونک کر اپنی گردن سیدھی کی اور اپنے آنچل کو سورج کے منہ میں دبا ہوا دیکھ کر سوچنے لگی۔

''کیا سورج بھی انسان ہو گیا ہے.......؟''

مگر دوسرے ہی لمحہ اُسے خیال آیا کہ سورج کو انسان کہنا، سورج کی توہین ہے۔ اس لئے سُنیتا نے مسکراتے ہوئے اُس کی طرف بڑے پیار سے دیکھا۔ دیکھتے ہی سورج نے آنچل چھوڑ دیا۔ اور آنچل کے چھوڑتے ہی سُنیتا نے بڑھ کر اُس کے منہ کو چوم لیا۔

ماضی ایک بار پھر بوند بوند یاد بن کر حال کی دھرتی پر ٹپکنے لگا تھا.......

دوسری بہن رنجیتا بہت خوبصورت تو نہیں تھی۔ لیکن اس کی آنکھوں میں بلا کا حسن تھا۔ جیسے سُرمے میں شراب ڈال کر وہ نہ صندل کی چھڑی سے اُسے آنکھ میں لگاتی رہی ہو۔ اس لئے جب کبھی ان آنکھوں میں کسی پر وقار مرد کی آنکھیں سماتیں، وہ اس طرح پھیل جاتی جیسے سورج کے نکلتے ہی رات کی تاریکی ساری کائنات پر محیط ہو جاتی ہے۔

اور ایک دن شخصیت سے بھرپور ایک مرد اُس کی زندگی میں ایسا آیا کہ رنجیتا سوتے جاگتے، اُٹھتے بیٹھتے، ہنستے بولتے، اور کھاتے پیتے صرف اسی کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔ اس طرح جب رنجیتا کے سامنے اُس نے شادی کی بات رکھی تو وہ لاکھ کوشش کے بعد بھی انکار نہ کر سکی۔ گھر والوں کی پسند کہیں اور تھی۔ اس کی پسند کہیں اور۔ اپنی پسند کی زندگی جینے کے لئے نوجوان کے ساتھ فرار ہونے کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔

رنجیتا کے چلے جانے کے بعد گھر والوں نے اُسے بہت ڈھونڈا۔ بہت انتظار کیا۔ لیکن وہ نہ ملی اور نہ ہی آئی۔ ہاں دو ماہ کے بعد ریڈ کراس ایریا میں ایک لڑکی نے روشن دان کی رسّی سے لٹک کر جو خودکشی کی تھی وہ کوئی اور نہیں رنجیتا ہی تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس نوجوان نے اُسے یہاں لا کر اچھی خاصی قیمت پر فروخت کیا تھا۔ وقت کے مختصر سے حصے میں زخموں

کی ایک اور نئی دنیا آباد ہوگئی۔

آج سُنیتا کی حرکت سورج سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ اس لئے وہ حیران تھا کہ آخر ہوا کیا ہے جو اس سے آج اس طرح کی بے رُخی برت رہی ہے۔ اس لئے اُس نے اس بار اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے سُنیتا کے چہرے کے سامنے اپنے سر کو لا کر دو تین بار زور سے ہلا یا۔ پَٹ پَٹ کی آواز سن کر سُنیتا ماضی کے زخموں کو سمیٹ کر حال کی وادی میں چلی آئی۔

تھوڑی دیر بعد جب سُنیتا اپنی بے ہنگم سانسوں کو درست کر چکی تب اُس کی محبت بھری نظریں سورج کی جانب اُٹھ گئیں۔ جن میں کئی سوالات پنہاں تھے۔

''دُنیا کا ہر مرد کُتّا ہوتا تو یہ دنیا......؟''

اس نے اس سوال کا خود ہی جواب دیا۔

''انسان، انسان ہے، وہ بھلا 'کُتّا' کیسے بن سکتا ہے۔''

اور پھر اس کی آنکھوں کے پردے پر تاریکی رقص کرنے لگی۔ اور ہر وہ چیز جو پہلے صاف نظر آیا کرتی تھی۔ دُھندلی دُھندلی سی نظر آنے لگی۔ لیکن سُنیتا اپنی دُھندلائی ہوئی آنکھوں سے اب بھی دیکھ رہی تھی، سورج اس کے قریب تاریکی میں ''ریڈیم'' کی مانند چمک رہا تھا۔ جس کی روشنی میں اُسے اپنا وجود بے حد روشن معلوم ہوا۔

یکا یک سُنیتا کے ہونٹ کپکپانے لگے اور جسم میں ایک عجیب سی لہر دوڑ گئی۔ پھر وہ اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی ایک انگڑائی کے ساتھ اُٹھی اور دروازے کی چٹخنی اُوپر چڑھائی اور سورج کو بانہوں میں بھینچ کر مزے سے پلنگ پر لڑھک گئی۔

☆☆☆